

مغربان

ظلال

(۲۰)

ظہ

زمانہ نزول | اس سورۃ کا زمانہ نزول سورۃ مریم کے زمانے قریب ہی کا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہجرت حبشہ کے زمانے میں یا اس کے بعد نازل ہوئی ہو۔ بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام سے پہلے یہ نازل ہو چکی تھی۔

ان کے قبول اسلام کی سب سے زیادہ مشہور اور معتبر روایت یہ ہے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تو راستہ میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تمہاری اپنی بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور ان کے بہنوئی سعید بن زید بیٹھے ہوئے حضرت خباب بن ارت سے ایک صحیفے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے آتے ہی ان کی بہن نے صحیفہ فوراً اچھپا لیا۔ مگر حضرت عمرؓ اس کے پڑھنے کی آواز سن چکے تھے۔ انہوں نے پہلے کچھ پوچھ گچھ کی۔ اس کے بعد بہنوئی پر پل پڑے اور مارنا شروع کر دیا۔ بہن نے بچانا چاہا تو انہیں بھی مارا بیان تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ آخر کار بہن اور بہنوئی دونوں نے کہا کہ ہاں ہم مسلمان ہو چکے ہیں تم سے جو کچھ ہو سکے کر لو۔ حضرت عمرؓ اپنی بہن کا خون بہنے دیکھ کر کچھ پشیمان سے ہو گئے اور کہنے لگے کہ اچھا مجھے بھی وہ چیز دکھاؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ بہن نے پہلے قسم لی کہ وہ اسے بھاڑ نہ دیں گے۔ پھر کہا کہ تم جب تک غسل نہ کرو، اس پاک صحیفے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور پھر وہ صحیفے لے کر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں ہی سورۃ ظہ لکھی ہوئی تھی۔ پڑھتے پڑھتے ایک نخت ان کی زبان سے نکلا۔ کیا خوب کلام ہے! یہ سنتے ہی حضرت خباب بن ارت، جو ان کی آہٹ پاتے ہی چھپ گئے تھے، باہر آگئے اور کہا کہ بخدا، مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے نبی کی دعوت پھیلانے میں بڑی خدمت لے گا، کل ہی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدایا، ابوالحکم بن ہشام (ابو جہل) یا عمر بن خطاب دونوں میں سے کسی کو اسلام کا حامی بنا دے۔ پس اسے عمر الشہکی طرف چلو، اللہ کی طرف چلو! اس فقرے نے رہی سہی کسر بھری کر دی اور اسی وقت حضرت خباب کے ساتھ جا کر حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کر لیا۔ یہ ہجرت حبشہ سے تھوڑی مدت بعد ہی کا واقعہ ہے۔

موضوع و مبحث | سورہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اے محمد! یہ قرآن تم پر کچھ اس لیے نازل نہیں کیا گیا ہے کہ خواہ تمہارا بیٹھ بٹھائے تم کو ایک مصیبت میں ڈال دیا جائے تم سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ ہتھڑکی پشانوں سے دودھ کی نہر نکالو، نہ ماننے والوں کو متوا کر چھوڑو، اور بٹ دھرم لوگوں کے دلوں میں ایمان

پیدا کر کے دکھاؤ۔ یہ تو بس ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے تاکہ جس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور جو اس کی پکڑ سے بچنا چاہے وہ سُن کر سجدہ صاف ہو جائے۔ یہ مالک زمین و آسمان کا کلام ہے۔ اور خدائی اس کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں اپنی جگہ اٹل ہیں، خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔

اس تمہید کے بعد یکایک حضرت موسیٰ کا قصہ چھیڑ دیا گیا ہے۔ بظاہر یہ محض ایک نکتے کی شکل میں بیان ہوا ہے۔ وقت کے حالات کی طرف اس میں کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ مگر جس ماحول میں یہ قصہ سنایا گیا ہے، اس کے حالات سے مل جل کر یہ اہل مکہ سے کچھ اور باتیں کرنا نظر آتا ہے جو اس کے الفاظ سے نہیں بلکہ اس کے بین السطور سے ادا ہو رہی ہیں۔ اُن باتوں کی تشریح سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ عرب میں کثیر التعداد یہودیوں کی موجودگی اور اہل عرب پر یہودیوں کے علمی و ذہنی تفوق کی وجہ سے انہیں اور حبش کی عیسائی سلطنتوں کے اثر سے بھی، عربوں میں بالعموم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی تسلیم کیا جانا تھا۔ اس حقیقت کو نظر میں رکھنے کے بعد اب دیکھیے کہ وہ باتیں کیا ہیں جو اس نکتے کے بین السطور سے اہل مکہ کو بتائی گئی ہیں:-

(۱) اللہ تعالیٰ کسی کو نبوت اس طرح عطا نہیں کیا کرتا کہ ڈھول تاشے اور نغیریاں بجا کر ایک خلق اکٹھی کرنی جائے اور پھر یا قاعدہ ایک تقریب کی صورت میں یہ اعلان کیا جائے کہ آج سے فلاں شخص کو ہم نے نبی مقرر کیا ہے۔ نبوت تو جس کو بھی دی گئی ہے، کچھ اسی طرح بعینہ راز دی گئی ہے جیسے حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی۔ اب تمہیں کیوں اس بات پر اچنبھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یکایک نبی بن کر تمہارے سامنے آگئے اور اس کا اعلان نہ آسمان سے جو زمین پر فرشتوں نے چل پھر کر اس کا ڈھول بٹایا۔ ایسے اعلانات پہلے نبیوں کے مقرر ہونے سے آج ہوتے؟

(۲) جو بات آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں (یعنی توحید اور آخرت) ٹھیک وہی بات منصب نبوت پر مقرر کرنے وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سکھائی تھی۔

(۳) پھر جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر کسی سرور سامان اور لاؤ لشکر کے نین تنہا قریش کے مقابلے میں دعوتِ حق کا علم بردار بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بھی یکایک اتنے بڑے کام پر مامور کر دیے گئے تھے کہ جا کر فرعون جیسے جبار بادشاہ کو سرکشی سے باز آنے کی تلقین کریں۔ کوئی لشکر اُن کے ساتھ بھی نہیں بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے ایسے ہی عجیب ہیں۔ وہ مدین سے مصر جانے والے ایک مسافر کو راہ چلتے پکڑ کر بلالیتا ہے اور کہتا ہے کہ جا اور وقت کے سب سے بڑے جابر حکمران سے ٹکرا جا بہت کیا تو اس کی درخواست پر اس کے بھائی کو مددگار کے طور پر دے دیا۔ کوئی فوج فراڈ یا غنی گھوڑے اس کا رُخیم کے لیے اس کو نہیں دیے گئے۔

(۴) جو اعتراضات اور تنہات اور الزامات اور مکر و نظم کے ہتھکنڈے سے اہل مکہ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں استعمال کر رہے ہیں اُن سے بڑھ چڑھ کر وہی سب ہتھیار فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں

استعمال کیسے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ کس طرح وہ اپنی ساری نند بیروں میں ناکام ہوا اور آخر کار کون غالب آکر رہا؟ خدا کا بے سرو سامان بننا؟ یا لاؤ لشکر الافرعون؟ اس سلسلہ میں خود مسلمانوں کو بھی ایک غیر ملغوظ فلسفی دی گئی ہے کہ اپنی بے سرو سامانی اور کفار قریش کے سرو سامان پر نہ جائیں، جس کام کے تیغیے خدا کا ماتہ ہوتا ہے وہ آخر کار غالب ہی ہو کر رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے ساحران مصر کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جب حق اُن پر کشف ہو گیا تو وہ بے دھوک اُس پر ایمان لے آئے اور پھر فرعون کے انتقام کا خوف انہیں بال برابر بھی ایمان کی راہ سے نہ ہٹا سکا۔

(۵) آخر میں بنی اسرائیل کی تاریخ سے ایک شہادت پیش کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دیوتاؤں اور مجسوموں کے گھر سے جانے کی ابتدا کس معنی کا انجیز طریقے سے ہوا کرتی ہے اور یہ کہ خدا کے نبی اس گھناؤنی چیز کا نام و نشان تک باقی رہنے کے کبھی روادار نہیں ہوتے ہیں۔ پس آج اس شرک اور بت پرستی کی جو مخالفت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں وہ نبوت کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔

اس طرح تعلق موسیٰ کے پیرائے میں اُن تمام معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اُس وقت اُن کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی کشمکش سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد ایک مختصر وعظ کیا گیا ہے کہ ہر حال یہ قرآن ایک نصیحت اور یاد دہانی ہے جو تمہاری اپنی زبان میں تم کو بھانسنے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ اس پر کان دھو گے اور اس سے سبق لو گے تو اپنا ہی بھلا کر گے۔ نہ مافو گے تو خود ڈرا انجام دیکھو گے۔

پھر آدم علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے یہ بات گھنائی گئی ہے کہ جس روز شیطان پر تم لوگ جا رہے ہو یہ دراصل شیطان کی پیروی ہے۔ اسی جانا شیطان کے ہکائے میں آجانا تو خیر ایک وقتی کمزوری ہے جس سے انسان مشکل ہی بچ سکتا ہے۔ مگنا آدمی کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ جب اس پر اس کی غلطی واضح کر دی جائے تو وہ اپنے باپ آدم کی طرح صاف صاف اس کا اعتراف کر لے، توبہ کرے، اور پھر خدا کی بندی کی طرف پلٹ آئے۔ غلطی اور اس پر ہٹ اور نصیحت پر نصیحت کیے جانے پر بھی اُس سے باز نہ آنا، اپنے پاؤں پر آپ کھٹاڑی مارنا ہے جس کا نقصان آدمی کو خود ہی بگھٹنا پڑے گا، کسی دوسرے کا کچھ نہ بگڑے گا۔

آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو گھمایا گیا ہے کہ ان منکرین حق کے معاملے میں جلدی اور بے صبری نہ کرو۔ غلام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و انکار پر فوراً نہیں بکڑھتا بلکہ سنبھلنے کے لیے کافی صبر دیتا ہے۔ لہذا گھراؤ نہیں۔ صبر کے ساتھ ان لوگوں کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جاؤ۔ اور نصیحت کا حق ادا کرتے رہو۔

اسی سلسلے میں نماز کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اہل ایمان میں صبر و تحمل، تقاضا، اور رضا بقضا اور احتساب کی وہ صفات پیدا ہوں جو دعوت حق کی خدمت کے لیے مطلوب ہیں۔

سُورَةُ طه مَكِّيَّةٌ ۱۳۵ آيَاتُهَا ۱۳۵
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طه ۱ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى ۲ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَخْشَى ۳
تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلَى ۴ الرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ
اسْتَوٰى ۵ لَهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ
الثُّرٰی ۶ وَاِنْ تُجْهَرُ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهُ یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی ۷ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ

ظہ، ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔ نازل کیا گیا ہے اُس ذات کی طرف جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ وہ رحمان (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے۔ مالک ہے اُن سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں۔ تم چاہے اپنی بات بچا کر کہو، وہ تو پچھلے سے کسی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے۔ وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی خدا

۱۔ یہ فقرہ پہلے فقرے کے مفہوم پر خود روشنی ڈالتا ہے۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے صاف مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کو نازل کر کے ہم کوئی اُن ہونا کام تم سے نہیں لینا چاہتے۔ تمہارے سپرد بہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جو لوگ نہیں ماننا چاہتے اُن کو منوا کر چھوڑ دو اور جن کے دل ایمان کے لیے بند ہو چکے ہیں ان کے اندر ایمان اتار کر ہی رہو۔ یہ تو بس ایک تذکرہ اور یاد دہانی ہے اور اس لیے بھیجی گئی ہے کہ جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو وہ اسے سن کر ہوش میں آ جائے۔ اب اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں خدا کا کچھ خوف نہیں، اور جنہیں اس کی کچھ پروا نہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، ان کے پیچھے پڑنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔
۲۔ یعنی پیدا کرنے کے بعد کہیں جا کر سونپیں گیا ہے بلکہ آپ اپنے کارخانہ تخلیق کا سارا انتظام چلا رہا ہے خود اس نا پیدا کما سلطنت پر فرمانروائی کر رہا ہے، خالق ہی نہیں ہے بالفعل حکمراں ہی ہے۔

۳۔ یعنی کچھ ضروری نہیں ہے کہ جو ظلم و ستم تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر ہو رہا ہے اور جن شرارتوں اور خباثتوں سے تمہیں نیچا دکھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں ان پر تم باوازن بلند ہی فریاد کرو۔ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ تم پر کیا کیفیت گزر رہی ہے۔ وہ تمہارے دلوں کی پکا تنگ سن رہا ہے۔

إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى ۝ وَهَلْ آتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ۝ إِذْ
 رَأَى نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا
 بِقَبَسٍ أَوْ أَجْدٍ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّا آتَاهَا نُودِيَ يَمْوَسَى ۝
 إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝

نہیں، اس کے لیے بہترین نام ہیں۔

اور تمہیں کچھ موسیٰ کی خبر بھی پہنچی ہے، جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے
 کہا کہ ”ذرا ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمہارے لیے ایک آدھا انکارا لے آؤں،
 یا اس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے“

وہاں پہنچا تو پکارا گیا ”اے موسیٰ! میں ہی تیرا رب ہوں، بھونٹیاں اتار دے۔ تو وادی مقدس طوی میں ہے

۷۵ یعنی وہ بہترین صفات کا مالک ہے۔

۷۵ یہ اُس وقت کا قلعہ ہے جب حضرت موسیٰ چند سال مذہب میں جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے بعد اپنی بیوی کو جن
 سے مذہب ہی میں شادی ہوئی تھی، لے کر مصر کی طرف واپس جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کی سرگزشت سورہ قصص میں بیان ہوئی
 ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ کے ہاتھوں ایک مصری ہلاک ہو گیا تھا اور اس پر انہیں اپنی گرفتاری کا اندیشہ لاحق ہو گیا
 تھا تو وہ مصر سے بھاگ کر مذہب میں پناہ گزین ہوئے تھے۔

۷۶ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا زمانہ تھا۔ حضرت موسیٰ حرمینہ نمائے سینا کے جنوبی
 علاقے سے گزر رہے تھے۔ دور سے ایک آگ دیکھ کر انہوں نے خیال کیا کہ یا تو وہاں سے تھوڑی سی آگ مل جائے گی تاکہ بال بچوں
 کو رات بھر گرم رکھنے کا بندوبست ہو جائے، یا کم از کم وہاں سے یہ پتھر مل جائے گا کہ آگے راستہ دکھائے۔ خیال کیا تھا دنیا
 کا راستہ ملنے کا، اور وہاں مل گیا عقبتی کا راستہ۔

۷۷ غالباً اسی واقعہ کی وجہ سے یہودیوں میں یہ شرعی مسئلہ بن گیا کہ جوتے پہننے ہوئے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے فرمایا خَالِفُوا الْيَهُودَ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّونَ فِي نَعَالِهِمْ (اختلافہم
 ”یہودیوں کے خلاف عمل کرو۔ کیونکہ وہ جوتے اور چمڑے کے موزے پہن کر نماز نہیں پڑھتے“ (البوداؤد)۔ اس کا یہ مطلب نہیں
 ہے کہ ضرور جوتے ہی پہن کر نماز پڑھنی چاہیے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، اس لیے دونوں طرح عمل کر دو۔ البوداؤد
 میں غزالی نے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں طرح نماز پڑھنے دیکھا ہے۔ مسند احمد اور البوداؤد

وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ﴿۱۳﴾ إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا
فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ﴿۱۴﴾ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ

اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے، سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے،
پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اس کا وقت

میں ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی مسجد آئے تو جو تے کو پلٹ کر دیکھ لے۔ اگر کوئی گندگی لگی ہو
تو زمین سے رگوں کو صاف کر لے اور انہی جو توں کو پینے ہوئے نماز پڑھ لے" ابو ہریرہؓ کی روایت میں حضور کے یہ الفاظ ہیں "اگر
تم میں سے کسی نے اپنے جوتے سے گندگی کو پا مال کیا ہو تو مٹی اس کو پاک کر دینے کے لیے کافی ہے" اور حضرت ام سلمہؓ کی روایت
میں ہے: "یطهه ما بعدا" یعنی "ایک جگہ گندگی لگی ہوگی تو دوسری جگہ جاتے جاتے خود زمین ہی اس کو پاک کر دے گی" ان
کثیر التعداد روایات کی بنا پر امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام اوزاعی اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ فقہا اس بات کے قائل ہیں
کہ جوتا بر حال میں زمین کی مٹی سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایک ایک قول امام احمد اور امام شافعی کا بھی اس کی تائید میں ہے۔ مگر امام
شافعی کا مشہور قول اس کے خلاف ہے۔ غالباً وہ جوتا پین کر نماز پڑھنے کو ادب کے خلاف سمجھ کر منع کرتے ہیں، اگرچہ سمجھا ہی گیا
ہے کہ ان کے نزدیک جوتا مٹی پر رگڑنے سے پاک نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں بہ امر قابل ذکر ہے کہ مسجد نبویؐ میں چٹائی تک کا فرش نہ
نقا، بلکہ کنکریاں بھی ہوتی تھیں۔ لہذا ان احادیث سے استدلال کر کے اگر کوئی شخص آج کی مسجدوں کے فرش پر جوتے لے
جانا چاہے تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ البتہ گھاس پر یا کھلے میدان میں جوتے پینے پینے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو میدان میں
نماز جنازہ پڑھتے وقت بھی جوتے اتارنے پر اصرار کرتے ہیں، وہ دراصل احکام سے نادانف ہیں۔

۱۵ عام خیال یہ ہے کہ "طوی" اس وادی کا نام تھا۔ مگر بعض مفسرین نے "وادی مقدس طوی" کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے

کہ "وہ وادی جو ایک ساعت کے لیے مقدس کر دی گئی ہے"

۱۶ یہاں نماز کی اصلی غرض پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آدمی خلا سے غافل نہ ہو جائے، دنیا کے دھوکا دینے والے

مظاہر اس کو اس حقیقت سے بے فکر نہ کر دیں کہ میں کسی کا بندہ ہوں، آزاد خود مختار نہیں ہوں۔ اس فکر کو تازہ رکھنے اور
خدا سے آدمی کا تعلق جوڑے رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے جو ہر روز کئی بار آدمی کو دنیا کے ہنگاموں سے ہٹا کر خدا
کی طرف لے جاتی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ نماز قائم کرنا کہ میں تجھے یاد کروں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا "اذکرونی"

اذکرونی "مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا"

ضمناً اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ جس شخص کو بھول لاشعور ہو جائے اسے جب بھی یاد آئے نماز ادا کر لینی

چاہیے۔ حدیث میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا من نسى صلاة فليصلها اذا ذكرها لا كفاة

أَخْفِيهَا لِيُخْزِي كُلَّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَى ۝۱۵ فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لَآئِيَمِنْ
بِهَا وَاتَّبِعْ هَوَاهُ فَتَرْدَى ۝۱۶ وَمَا تِلْكَ بِبَيْتِكَ يَمُوسَى ۝۱۷ قَالَ
هِيَ عَصَائِي أَتَوَكَّلُوا عَلَيْهَا وَاهْتَسُّ بِهَا عَلَى غَمِّي وَلِي فِيهَا مَارِبٌ أُخْرَى ۝۱۸

مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے پس کوئی ایسا شخص جو اس پر
ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہے تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک لے اور نہ
تو بلاکت میں پڑ جائے گا۔ اور اے موسیٰ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟

موسیٰ نے جواب دیا "یہ میری لاشی ہے" اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں
کے لیے پتے بھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں۔"

لَهَا الْاَذْلَكُ، "جو شخص کسی وقت کی نماز بھول گیا ہو اسے چاہیے کہ جب یاد آئے ادا کر لے، اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں
ہے" (بخاری، مسلم، احمد)۔ اسی معنی میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہ سے بھی مروی ہے جسے مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے
لیا ہے۔ اور ابو قتادہ کی روایت ہے کہ حضور سے پوچھا گیا اگر ہم نماز کے وقت سو گئے ہوں تو کیا کریں؟ آپ نے فرمایا "نیند
میں کچھ تصور نہیں، تصور تو جاگنے کی حالت میں ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص بھول جائے یا سو جائے تو جب بیدار ہو
یا جب یاد آئے، نماز پڑھ لے" (ترمذی، نسائی، ابوداؤد)

۱۵۔ توجید کے بعد دوسری حقیقت جو ہر زمانے میں تمام انبیاء علیہم السلام پر منکشف کی گئی اور جس کی تعلیم دینے
پر وہ مامور کیے گئے، آخرت ہے۔ یہاں نہ صرف اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کے مقصد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔
یہ ساعت منتظر اس لیے آئے گی کہ ہر شخص نے دنیا میں جو سعی کی ہے اس کا بدلہ آخرت میں پائے۔ اور اس کے وقت کو مخفی بھی
اس لیے رکھا گیا ہے کہ آزمائش کا مدعا پورا ہو سکے۔ جسے عاقبت کی کچھ فکر ہو اس کو ہر وقت اس گھڑی کا کھٹکا لگا رہے اور
یہ کھٹکا اسے بے راہ روی سے بچاتا رہے۔ اور جو دنیا میں گم رہنا چاہتا ہو وہ اس خیال میں مگن رہے کہ قیامت ابھی کہیں دور
دور بھی آئی نظر نہیں آتی۔

۱۶۔ یہ سوال طلب علم کے لیے نہ تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کو بھی معلوم تھا کہ موسیٰ کے ہاتھ میں لاشی ہے۔ پوچھنے
سے مقصود یہ تھا کہ لاشی کا لاشی ہونا حضرت موسیٰ کے ذہن میں اچھی طرح مستحضر ہو جائے اور پھر وہ اللہ کی قدرت کا اثر مند کہیں۔
۱۷۔ اگرچہ جواب میں صرف اتنا کہ دنیا کافی تھا کہ حضور یہ لاشی ہے، مگر حضرت موسیٰ نے اس سوال کا جو لمبا
جواب دیا وہ ان کی اس ذہنی کیفیت کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جب آدمی کو کسی بہت

قَالَ لِقَوْمِهَا يَمُوسَى ۱۹) فَالْقَوْمَ فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى ۲۰) قَالَ خُذْهَا
وَلَا تَخَفْ ۲۱) سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَى ۲۲) وَاضْمُمْ يَدَكَ
إِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَى ۲۳)
لِتُرِيكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ۲۴) إِذْ هَبَّ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى ۲۵)

فرمایا "پھینک دے اس کو موٹی۔"

اس نے پھینک دیا اور بچا ایک وہ ایک سانپ تھی جو دوڑ رہا تھا
فرمایا "پکڑ لے اس کو اور ڈر نہیں ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ
اپنی بغل میں دبا، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ اس لیے کہ ہم تجھے
اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا، وہ مکرش ہو گیا ہے۔"

بڑی شخصیت سے بات کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو وہ اپنی بات کو طول دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اُسے زیادہ سے زیادہ دیر
تک اُس کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل رہے۔

۱۳ یعنی روشن ایسا ہو گا جیسے سورج ہو، مگر نہیں اس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بائبل میں یہ بیضاء کی ایک اور ہی تفسیر کی
گئی ہے جو وہاں سے نکل کر ہمارے ماں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گئی۔ وہ یہ کہ حضرت موسیٰ نے جب بغل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو
پورا ہاتھ برص کے مریض کی طرح سفید تھا، پھر جب دوبارہ اُسے بغل میں رکھا تو وہ اصل حالت پر آ گیا۔ یہی تفسیر اس معجزے کی تلمیح
میں بھی بیان کی گئی ہے اور اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ فرعون کو برص کی بیماری تھی جسے وہ چھپاٹے ہوئے تھا، اس لیے اس کے
سامنے یہ معجزہ پیش کیا گیا کہ دیکھو یوں آنا نائبرص کا مرض پیدا بھی ہوتا ہے اور کافر بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اول تو ذوق سلیم اس
سے باکرتا ہے کہ کسی نبی کو برص کا معجزہ دے کر ایک بادشاہ کے دربار میں بھیجا جائے۔ دوسرے اگر فرعون کو مخفی طور پر یہ
برص کی بیماری تھی تو یہ بیضاء صرف اُس کی ذات کے لیے معجزہ ہو سکتا تھا، اس کے درباریوں پر اس معجزے کا کیا رعب
طاری ہوتا۔ لہذا صحیح بات وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی کہ اس ہاتھ میں سورج کی سی چمک پیدا ہو جاتی تھی جسے دیکھ کر
آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ قدیم مفسرین میں سے بھی بہتوں نے اس کے ہی معنی لیے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾ وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِّنْ عِندِكَ مِّنْ لِّسَانِي ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِّنْ

موسیٰ نے عرض کیا "پروردگارا! میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گره سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر

۱۴ یعنی میرے دل میں اس منصب عظیم کو نبھانے کی ہمت پیدا کر دے۔ اور میرا حوصلہ بڑھا دے۔ چونکہ یہ ایک بہت بڑا کام حضرت موسیٰ کے سپرد کیا جا رہا تھا جس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی، اس لیے آپ نے دعا کی کہ مجھے وہ صبر و شہادت، وہ تحمل، وہ بے خوفی اور وہ عزم عطا کر جو اس کام کے لیے درکار ہے۔

۱۵ بائبل میں اس کی جو تشریح بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے عرض کیا "اے خداوند! میں نصیح نہیں ہوں نہ پہلے ہی تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا۔ بلکہ رگ رگ کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے" (حروج ۱۰: ۴)۔ مگر تلمود میں اس کا ایک لمبا چوڑا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ پچھن میں جب حضرت موسیٰ فرعون کے گھر پر درشنس پارہے تھے، ایک روز انہوں نے فرعون کے سر کا تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اس بچے نے یہ کام بالارادہ کیا ہے یا یہ محض طفلانہ فعل ہے۔ آخر کار یہ تجویز کیا گیا کہ بچے کے سامنے سونا اور آگ دونوں ساتھ رکھے جائیں چنانچہ دونوں چیزوں لاکر سامنے رکھی گئیں اور حضرت موسیٰ نے اٹھا کر آگ منہ میں رکھ لی۔ اس طرح ان کی جان تونج گئی، مگر زبان میں ہمیشہ کے لیے لکنت پڑ گئی۔

یہی قصہ اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گیا۔ لیکن عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے۔ اس لیے کہ اگر بچے نے آگ پر ہاتھ مارا بھی ہو تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ انگارے کو اٹھا کر منہ میں لے جائے۔ بچہ تو آگ کی جلن محسوس کرتے ہی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ منہ میں لے جانے کی نوبت ہی کہاں آسکتی ہے؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اندر خطابت کی صلاحیت نہ پاتے تھے اور ان کو اندیشہ لاحق تھا کہ قوت کے فرائض ادا کرنے کے لیے اگر تقریر کی ضرورت کبھی پیش آئی جس کا انہیں اس وقت تک اتفاق نہ ہوا تھا، تو ان کی طبیعت کی جھجک مانع ہو جائے گی۔ اس لیے انہوں نے دعا فرمائی کہ بال اللہ میری زبان کی گره کھول دے تاکہ میں اچھی طرح اپنی بات لوگوں کو سمجھا سکوں۔ یہی چیز تھی جس کا فرعون نے ایک مرتبہ ان کو طعنہ دیا کہ یہ شخص تو اپنی بات بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکتا، "وَلَا يَكَادُ يُبِينُ"۔ سائڈ طرف ۶۰ اور یہی کمزوری تھی جس کو محسوس کر کے حضرت موسیٰ نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون کو مددگار کے طور پر مانگا۔ سورہ قصص میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے "وَأَرْخَىٰ لَهُمْ ذَنُّهُمُ فَصَبَّحُوا فَصَبَّحُوا بِصِدْقٍ لِّسَانًا فَآذَيْنَاهُ بِمَعْنَىٰ ذَا"۔ "میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج ڈالو گے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی یہ کمزوری دور ہو گئی تھی اور وہ خوب زور دار تقریر کرنے لگے تھے، چنانچہ قرآن میں اور بائبل میں ان کی بعد کے دور کی جو تقریریں

اَهْلِي ۳۲ هَارُونَ أَخِي ۳۰ اَشْدُدْ بِهِ اَزْرِي ۳۱ وَاَشْرِكُهُ فِي اَمْرِي ۳۲
 كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۳۳ وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۳۴ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۳۵
 قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُوْلَكَ يَمُوْسَى ۳۶ وَلَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ فَهَرَّةً اٰخَرَى ۳۷
 اِذْ اَوْحَيْنَا اِلَى اَمِكَ مَا يُوحَى ۳۸ اِنْ اَقْنَدِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاَقْنِدِيْهِ
 فِي الْيَمِّ فَلْيُقِهِ الْيَمُّ بِالسَّحْلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهُ ۳۹

مقرر کرے۔ ہارون جو میرا بھائی ہے۔ اُس کے ذریعے سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام
 میں شریک کر دے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے
 حال پر نگراں رہا ہے۔

فرمایا ”دیا گیا جو تو نے مانگا اے موسیٰ، ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا۔ یاد کرو وہ وقت جبکہ
 ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا، ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعے سے ہی کیا جاتا ہے کہ اس بچے کو صندوق میں رکھ دے
 اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے۔ دریا اسے ساحل پر پھینک دیگا اور اسے میرا دشمن اور اس بچے کا دشمن اٹھالیگا۔

آئی ہیں وہ کمال فصاحت و طلاقت لسانی کی شہادت دیتی ہیں۔

یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بچے یا تو تلے آدمی کو اپنا رسول مقرر فرمائے۔ رسول ہمیشہ شکل صورت،
 شخصیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بہترین لوگ ہوتے ہیں جن کے ظاہر و باطن کا ہر پہلو دونوں اور نگاہوں کو متاثر کرنے
 والا ہوتا تھا۔ کوئی رسول ایسے عیب کے ساتھ نہیں بھیجا گیا اور نہیں بھیجا جاسکتا تھا جس کی بنا پر وہ لوگوں میں مضحکہ بن جائے یا ستار
 کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

۱۶ ہائیل کی روایت کے مطابق حضرت ہارون حضرت موسیٰ سے تین برس بڑے تھے (خروج ۷: ۷)

۱۷ اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کو ایک ایک کر کے وہ احسانات یاد دلانا چاہے جو پیدائش کے وقت سے
 لے کر اس وقت تک اس نے ان پر کیے تھے۔ ان واقعات کی تفصیل سورہ نضص میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں صرف اشارات
 کیے گئے ہیں جن سے مقصود حضرت موسیٰ کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم اسی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو اور اسی کام کے لیے آج تک
 خاص طور پر سرکاری نگرانی میں پرورش پاتے رہے ہو جس پر اب تمہیں مامور کیا جا رہا ہے۔

وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ حَبَابًا مِّنِّي ۗ وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ﴿۳۱﴾ إِذْ
تَنَشَّىٰ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُ ۗ فَرَجَعْنَاكَ
إِلَىٰ أُمِّكَ كَمَا تَفَرَّقَ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنُ ۗ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَبَعَيْنِكَ
مِنَ الْغَمِّ ۗ وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا ۗ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ۗ
ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ ﴿۳۲﴾ وَأَصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ﴿۳۳﴾ إِذْ هَبُّ
أَنْتَ وَآخُوكَ بِأَيْتِي وَلَا تَدْبِيَا فِي ذِكْرِي ﴿۳۴﴾ إِذْ هَبَّ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ
طَغَىٰ ﴿۳۵﴾ فَقَوْلًا لَهُ قَوْلًا لِّبَنَاتِنَا أَلَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَحْشَىٰ ﴿۳۶﴾

میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے۔
یاد کر جبکہ تیری بہن چل رہی تھی، پھر جا کر کہتی ہے، ”میں تمہیں اس کا پتہ دوں جو اس بچے
کی پرورش اچھی طرح کرے“ اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھ
ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو۔ اور یہ بھی یاد کر کہ تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، ہم نے
تجھے اس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمائشوں سے گزارا اور تو مدین کے لوگوں میں کئی سال
ٹھہرا رہا۔ پھر اب ٹھیک اپنے وقت پر تو آ گیا ہے اسے موسیٰ۔ میں نے تجھ کو اپنے کام کا بنا لیا ہے۔
جا، تو اور تیرا بھائی میری نشانہوں کے ساتھ۔ اور دیکھو تم میری یاد میں تفصیر نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں
فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول
کرے یا ڈر جائے۔“

۱۸ آدمی کے راہ راست پر آنے کی دو ہی شکلیں ہیں۔ یا توجہ تفہیم و تلقین سے مطمئن ہو کر صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے یا

پھر بڑے انجام سے ڈر کر سیدھا ہو جاتا ہے۔

قَالَ رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرَطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَى ۝۳۵ قَالَ لَا تَخَافَا
 إِنِّي مَعَكُمْ أَسْمَعُ وَآدِي ۝۳۶ فَأَتِيَهُ فَقَوْلَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ
 مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّنْ رَبِّكَ وَالسَّلَامُ
 عَلَيَّ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى ۝۳۷ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ تَوَلَّى ۝۳۸

دونوں نے عرض کیا ”پروردگار ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا۔“

فرمایا ”ڈرو مت، میں تمہارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستائے ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اُس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اُس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔“

۱۸ اللہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت موسیٰ مصر پہنچ گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام ان کے شریک کار ہو گئے اس وقت فرعون کے پاس جانے سے پہلے دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ گزارش کی ہوگی۔

۱۹ اس واقعے کو بائبل اور تلمود میں جس طرح بیان کیا گیا ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے تاکہ اندازہ ہو کہ قرآن مجید انبیاء علیہم السلام کا ذکر کس شان سے کرتا ہے اور بنی اسرائیل کی روایات میں ان کی کیسی تصویر پیش کی گئی ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ پہلی مرتبہ جب خدانے موسیٰ سے کہا کہ ”اب میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو میری قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے“ تو حضرت موسیٰ نے جواب میں کہا ”میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لاؤں“ پھر خدانے حضرت موسیٰ کو بت کچھ سمجھایا، ان کی ذمہ داری بندھائی، معجزے عطا کیے، مگر حضرت موسیٰ نے پھر کہا تو یہی کہا کہ ”اے خداوند، میں تیری منت کرتا ہوں کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے یہ پیغام بھیج“ (خروج ۴)۔ تلمود کی روایت اس سے بھی چند قدم آگے جاتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ کے درمیان سات دن تک اسی بات پر رد و رد کہ ہوتی رہی۔ اللہ کہتا رہا کہ ”موسیٰ بن، مگر موسیٰ کہتے رہے کہ میری زبان ہی نہیں کھلتی تو میں نبی کیسے بن جاؤں۔ آخر اللہ نے کہا میری خوشی یہ ہے کہ تو ہی بن۔ اس پر حضرت موسیٰ نے کہا کہ لو تو کو بچانے کے لیے آپ نے فرشتے بھیجے، ہاجرہ جب سارہ کے گھر سے نکلی تو اس کے لیے پانچ فرشتے بھیجے، اور اب اپنے خاص بچوں (بنی اسرائیل) کو مصر سے نکلوانے کے لیے آپ مجھے بھیج رہے ہیں۔ اس پر خدانے راض ہو گیا اور اس نے رسالت میں ان کے ساتھ ہارون کو شریک کر دیا اور موسیٰ کی اولاد کو محروم کر کے کمالت کا منصب ہارون کی اولاد کو دے دیا۔ یہ کتابیں ہیں جن کے متعلق بے شرم لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ان سے یہ قصے نقل کر لیے گئے ہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوسَى ۝۲۹ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ

فرعونؑ نے کہا ”اچھا، تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰؑ؟“
موسیٰؑ نے جواب دیا ”ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی،

۲۹۔ یہاں قصے کی ان تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح فرعون کے پاس پہنچے اور کس طرح اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کی۔ یہ تفصیلات سورۃ اعراف رکوع ۳۱ میں گزر چکی ہیں اور آگے سورۃ شعرا رکوع ۲-۳ سورۃ قصص رکوع ۴، اور سورۃ نازعات رکوع میں آنے والی ہیں۔

فرعون کے متعلق ضروری معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۵۔

۳۰۔ دونوں بھائیوں میں سے اصل صاحب دعوت چو نکہ موسیٰؑ علیہ السلام تھے اس لیے فرعون نے انہی کو مخاطب کیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ خطاب کا رخ ان کی طرف رکھنے سے اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ وہ حضرت ہارون کی فصاحت و بلاغت کو میدان میں آنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو اور خطابت کے پہلو میں حضرت موسیٰؑ کے ضعف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو جس کا ذکر اس سے پہلے کر چکا ہے۔ فرعون کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ تم دونوں کسے رب بنا بیٹھے ہو، مصر اور اہل مصر کا رب تو میں ہوں۔ سورۃ نازعات میں اس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ **أَنذَرْتُكُمْ الْآخِلَ، ۱۱** سے اہل مصر تمہارا رب اعلیٰ میں ہوں، سورۃ زمرت میں وہ بھرے دربار کو مخاطب کر کے کہتا ہے **يَقُولُ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ لِي مُلْكٌ مِّمَّا يَدْعُونَ ۚ لَا تِلْكَ أَلِهَا شُجْرَتِي مِنْ تَحْتِي، ۱۱** اے قوم، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہیں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں، ۱۱۔ اور آیت ۵۱۔ سورۃ قصص میں وہ اپنے درباریوں کے سامنے یوں بنکارتا ہے **يَا أَيُّهَا الْمَلَأَ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ عَذَابٌ، فَأَوْقِدْ لِي يَا هَٰذَا مَنْ عَلَى الطَّيِّبِ فَاجْعَلْ لِي صَهْرًا لَعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَى اللَّهِ مُوسَى، ۱۱** اے سردارِ قوم، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور بھی الہ ہے، اے ہامان، ذرا اینٹیں پکوا اور ایک بلند عمارت میرے لیے تیار کرنا تاکہ میں ذرا اوپر چوہہ کر دیکھوں تو سہی کہ یہ موسیٰؑ کے الٰہ بنا رہا ہے، ۱۱۔ اور آیت ۳۸۔ سورۃ شعراء میں وہ حضرت موسیٰؑ کو ڈانٹ کر کہتا ہے کہ **إِن اتَّخَذْتِ الرَّهْمَ عَذَابِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْخُوفِينَ، ۱۱** اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ بنا یا تو یاد رکھ کہ تجھے جیل بھیج دوں گا، ۱۱۔ آیت ۲۹۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرعون اپنی قوم کا واحد موجود تھا اور وہاں اس کے سوا کسی کی پرستش نہ ہوتی تھی۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ فرعون خود سورج دیوتا (رع یا راع) کے اوتار کی حیثیت سے بادشاہی کا استحقاق جتاتا تھا، اور یہ بات بھی معرکے تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قوم کے مذہب میں بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس لیے فرعون کا دعویٰ ”واحد کون پرستش“ ہونے کا نہ تھا، بلکہ وہ عملاً مصر کی اور نظریے کے اعتبار سے دراصل پوری نوع انسان کی سیاسی ربوبیت خلاقہ ندی کا مدعی تھا اور یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسری ہستی فرما کر وہ اس کا نمائندہ آکر اسے ایک حکم دے اور اس حکم کی اطاعت کا مطالبہ اس سے کرے۔ بعض لوگوں کو اس کی کن ترانیوں سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ

ثُمَّ هَدَىٰ ۝ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ۝

پھر اس کو راستہ بتایا۔

فرعون بولا "اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت تھی؟"

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر تھا اور خود خدا ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے کہ وہ عالم بالا پر کسی اور کی حکمرانی مانتا تھا۔ سورۃ المؤمن آیات ۲۸ تا ۳۴ اور سورۃ زمر آیت ۵۳ کو غور سے دیکھیے۔ یہ آیتیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی ہستی سے اُس کو انکار نہ تھا۔ البتہ جس چیز کو ماننے کے لیے وہ تیار نہ تھا وہ یہ تھی کہ اس کی سیاسی خدائی میں اللہ کا کوئی دخل ہو اور اللہ کا کوئی رسول آکر اُس پر حکم چلائے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم، القمص، حاشیہ ۵۳)۔

۵۲۲ یعنی ہم ہر معنی میں صرف اس کو رب مانتے ہیں۔ پروردگار، آقا، مالک، حاکم، سب کچھ ہمارے نزدیک وہی ہے کسی معنی میں بھی اس کے سوا کوئی دوسرا رب ہمیں تسلیم نہیں ہے۔

۵۲۳ یعنی دنیا کی برائے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اُس کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل و صورت، جو قوت و صلاحیت، اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے، اُس کے عطا اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اس کو دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اس کو بخشی انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، برقی، ہر ایک چیز کو اس نے وہ صورت خاص عطا کی ہے جو اسے کائنات میں اپنے حصے کا کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔ پھر اس نے ایسا نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر پونہی چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے نہ سکھایا ہو۔ ساکن کو سنانا اور آنکھ کو دیکھنا اُس نے سکھایا ہے۔ چھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا اُس کی تعلیم سے آیا ہے۔ درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اگانے کی ہدایت اسی نے دی ہے۔ غرض وہ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں، ہادی اور معلم بھی ہے۔ اس بے نظیر جامع و مختصر جملے میں حضرت موسیٰ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ان کا رب کون ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ کیوں رب ہے اور کس لیے اُس کے سوا کسی اور کو رب نہیں مانا جا سکتا۔ دعویٰ کے ساتھ اس کی دلیل بھی اسی چھوٹے سے فقرے میں آگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فرعون اور اس کی رعایا کا ہر فرد اپنے وجود خاص کے لیے اللہ کا مقنون احسان ہے، اور جب ان میں سے کوئی ایک لمحہ کے لیے زندہ تک نہیں رہ سکتا جب تک اس کا دل اور اس کے پیپھر سے اور اس کا سجدہ و جگر اللہ کی دی ہوئی ہدایت سے اپنا کام نہ کیے چلے جائیں، تو فرعون کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب ہے، اور لوگوں کا یہ ماننا کہ وہ واقعی ان کا رب ہے، ایک حماقت اور ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مزید برآں، اسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰ نے اشارۃً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی جس کے ماننے سے فرعون کو

قَالَ عَلِمَهَا عِنْدَ سَرِيٍّ فِي كِتَابٍ ۚ لَا يَبْضُلُ سَرِيٌّ وَلَا يَنْسَى ۝۵۲

موسىٰ نے کہا "اُس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔"

انکار فقط ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا بادی ہے، اور جو ہر چیز کو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، اس کے عالمگیر منصب ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے بھی رہنمائی کا انتظام کرے۔ اور انسان کی شعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ شکل موزوں نہیں ہو سکتی جو ٹھیک اور مرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوا اور وہ ان کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انہیں سیدھا راستہ بتائے۔

۵۲ یعنی اگر بات یہی ہے کہ جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور زندگی میں کام کرنے کا راستہ بتایا اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے، تو یہ ہم سب کے باپ دادا جو صد ہا برس سے نسل در نسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کی تمہارے نزدیک کیا پوزیشن ہے؟ کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا وہ سب غلاب کے مستحق تھے؟ کیا ان سب کی عقلیں ماری گئی تھیں؟ یہ نکاح فرعون کے پاس حضرت موسیٰ کی اس دلیل کا جواب۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جواب اُس نے برنٹائے جمالت دیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ برنٹائے سزائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں دونوں باتیں شامل ہوں، یعنی وہ خود بھی اس بات پر تھکا گیا ہو کہ اس مذہب کے ہمارے تمام بزرگوں کی گمراہی لازم آتی ہے، اور ساتھ ساتھ اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ اپنے اہل دربار اور عام اہل مصر کے دلوں میں حضرت موسیٰ کی دعوت کے خلاف ایک تعصب بھڑکا دے۔ اہل حق کی تبلیغ کے خلاف یہ تھکانا ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے اور جاہلوں کو مشغول کرنے کے لیے بڑا موثر ثابت ہوا ہے۔ خصوصاً اُس زمانہ میں جبکہ قرآن کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو بچا دکھانے کے لیے سب سے زیادہ اسی تھکاندے سے کام لیا جا رہا تھا، اس لیے حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کی اس مکاری کا ذکر یہاں بالکل بر محل تھا۔

۵۲ یہ ایک نہایت ہی حکیمانہ جواب ہے جو حضرت موسیٰ نے اس وقت دیا اور اس سے حکمت تبلیغ کا ایک بہترین سبق حاصل ہوتا ہے۔ فرعون کا مقصد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سامعین کے، اور ان کے توسط سے پوری قوم کے دلوں میں تعصب کی آگ بھڑکانا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ کہتے کہ ہاں وہ سب جاہل اور گمراہ تھے اور سب کے سب جہنم کا ابدی صحن بنیں گے تو چاہے یہ سخن کوئی کاثر زبردست نمونہ ہوتا، مگر یہ جواب حضرت موسیٰ کے بجائے فرعون کے مقصد کی زیادہ خدمت انجام دیتا۔ اس لیے آنجناب نے کمال دانائی کے ساتھ ایسا جواب دیا جو بجائے خود حق ہی تھا، اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے زہریلے دانت میں توڑ دیے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے، اپنا کام کر کے خدا کے ہاں جا چکے ہیں۔ میرے پاس ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگاؤں۔ ان کا پورا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت اور اس کے محرکات کو خدا جانتا ہے۔ نہ خدا کی نگاہ سے کوئی چیز چھپی رہ گئی ہے اور نہ اس کے حافظہ سے کوئی شے محو ہوئی ہے۔ ان سے جو کچھ بھی معاملہ خدا کو کرنا ہے اس کو وہی جانتا ہے۔ مجھے اور تمہیں یہ فکر نہیں

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ هَدًى وَ سَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَ
 أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتَّى ۝۵۳
 كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النَّهْيِ ۝۵۴ وَمِنْهَا
 خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى ۝۵۵



وہی جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور اُس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے، اور اوپر سے پانی برسایا، پھر اُس کے ذریعے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔ اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

ہونی چاہیے کہ ان کا موقف کیا تھا اور ان کا انجام کیا ہوگا۔ ہمیں تو اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہمارا موقف کیا ہے اور ہمیں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

۲۶ انداز کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا جواب ”نہ یجوز“ ہے، پر ختم ہو گیا، اور یہاں سے آخر پر آگات تک کی پوری عبارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور شرح و تذکیر ارشاد ہوئی ہے۔ قرآن میں اس طرح کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ کسی گزیرے ہوئے یا آئندہ پیش آنے والے واقعے کو بیان کرتے ہوئے جب کسی شخص کا کوئی قول نقل کیا جاتا ہے، تو اس کے بعد منضلاً چند فقرے و عطف و پند یا شرح و تفسیر یا تفصیل و توضیح کے طور پر مزید ارشاد فرمائے جاتے ہیں اور صرف انداز کلام سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اس شخص کا قول نہیں ہے جس کا پہلے ذکر ہو رہا تھا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول ہے۔

واضح رہے کہ اس عبارت کا تعلق صرف قریب کے فقرے ”میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بخودتا ہے“ سے ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کے پورے کلام سے ہے جو رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَيًّا سے شروع ہوا ہے۔

۲۷ یعنی جو لوگ عقل سلیم سے کام لے کر جستجوئے حق کرنا چاہتے ہوں وہ ان نشانات کی مدد سے منطقی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ نشانات ان کو بتادیں گے کہ اس کا ثنات کا ایک رب ہے اور ربوبیت ساری کی ساری اسی کی ہے۔ کسی دوسرے رب کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۲۸ یعنی ہر انسان کو لازماً تین مرحلوں سے گزرنا ہے۔ ایک مرحلہ موجودہ دنیا میں پیدائش سے لے کر موت تک کا۔ دوسرا مرحلہ موت سے قیامت تک کا۔ اور تیسرا قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کا مرحلہ۔ یہ تینوں مرحلے اس

وَلَقَدْ آرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٤﴾ قَالَ أَجْعَلْنَا لِنُخْرِجَنَّا
 مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿٥٥﴾ فَلَمَّا تَبَيَّنَكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَأَجْعَلْ
 بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٥﴾

ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا۔
 کہنے لگا "اے موسیٰ، کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو
 ہمارے ملک سے نکال باہر کرے؟ اچھا، ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادو لاتے ہیں۔
 طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے۔ نہ ہم اس قرار داد سے پھر میں گئے نہ تو پھر یوں۔ کھلے
 میدان میں سامنے آ جا۔"

آیت کی رو سے اسی زمین پر گورنر نے والے ہیں۔

۵۴ یعنی آفات و انفس کے دلائل کی نشانیاں بھی، اور وہ معجزات بھی جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے تھے۔ قرآن میں متعدد
 مقامات پر حضرت موسیٰ کی وہ تقریریں بھی موجود ہیں جو انہوں نے فرعون کو سمجھانے کے لیے کیں۔ اور وہ معجزات بھی مذکور ہیں جو اس
 کو پے در پے دکھائے گئے۔

۵۵ جادو سے مراد عصا اور بیضا کا معجزہ ہے جو سورہ اعراف اور سورہ شعراء کی تفصیلات کے بموجب حضرت موسیٰ
 نے پہلی ہی ملاقات کے وقت بھرے دربار میں پیش کیا تھا۔ اس معجزے کو دیکھ کر فرعون پر جو بدحواسی طاری ہوئی اس کا اندازہ
 اس کے اسی فقرے سے کیا جاسکتا ہے کہ تو اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں نہ پہلے
 کبھی یہ واقعہ پیش آیا تھا اور نہ بعد میں کبھی پیش آیا کہ کسی جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے کوئی ملک فتح کر لیا ہو۔ فرعون کے اپنے ملک میں
 سینکڑوں ہزاروں جادوگر موجود تھے جو تمنا سے دکھا دکھا کر انعام کے لیے ہاتھ پھیلاتے پھرتے تھے۔ اس لیے فرعون کا ایک طرف یہ کہنا کہ
 تو جادوگر ہے، اور دوسری طرف یہ خطرہ ظاہر کرنا کہ تو میری سلطنت چھین لینا چاہتا ہے، کھلی ہوئی بدحواسی کی علامت ہے۔ دراصل وہ حضرت
 موسیٰ کی معقول و مدلل تقریر، اور پھر ان کے معجزے کو دیکھ کر یہ سمجھ گیا تھا کہ نہ صرف اس کے اہل دربار، بلکہ اس کی رعایا کے بھی
 عوام و خواص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اس لیے اس نے مجبوت اور فریب اور تعصبات کی انجینٹ سے کام نکالنے کی
 کوشش شروع کر دی۔ اس نے کہا یہ معجزہ نہیں جادو ہے اور ہماری سلطنت کا ہر جادوگر اسی طرح لاشعی کو سانپ بنا کر دکھا سکتا ہے اس
 نے کہا کہ لوگو، ذرا دیکھو یہ تمہارے باپ دادا کو گمراہ اور ضعیف ٹھیرا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگو، ہوشیار ہو جاؤ، یہ پیغمبر و تعبیر کچھ نہیں ہے، انتظار
 کا ہوا کا ہے، چاہتا ہے کہ یوسف کے زمانے کی طرح پھر بنی اسرائیل یہاں حکمراں ہو جائیں اور قبیلہ قوم سے سلطنت چھین لی جائے۔ ان

اللہ کذاباً فیسحبتکم بعدایہ وقد خاب من افتوی ﴿۶۱﴾ فتنازعوا
اہلہم بینہم واسرو والنجوی ﴿۶۲﴾ قالوا ان ہذا من لسیحین یریدن ان

باندھو اللہ پر اور نہ وہ ایک سخت عذاب سے تمہارا ستیاناس کر دے گا۔ جھوٹ جس نے بھی گھڑا
وہ نامراد ہوا۔

یہ سن کر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔
آخر کار کچھ لوگوں نے کہا کہ ”یہ دونوں تو محض جادو گر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے

بمذہب لوگ آبادی کا کم از کم دس فی صدی حصہ لیں۔ اس کے علاوہ اُس مذہبی انقلاب کو ابھی پورے ڈیڑھ سو برس بھی
نہ گزرے تھے جو فرعون امینوفس یا اخناتون (۱۳۵۰ء تا ۱۳۳۶ء ق م) نے حکومت کے زور سے برپا کیا تھا، جس میں تمام
معبودوں کو ختم کر کے صرف ایک معبود آتون باقی رکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس انقلاب کو بعد میں حکومت ہی کے زور سے اُلٹ
دیا گیا، مگر کچھ نہ کچھ تو اپنے اثرات وہ بھی چھوڑ گیا تھا۔ ان حالات کو نگاہ میں رکھا جائے تو فرعون کی وہ گجراہٹ اچھی طرح سمجھ میں
آجاتی ہے جو اس موقع پر اسے لاحق تھی۔

۶۱۔ یہ خطاب عوام سے نہ تھا جنہیں ابھی حضرت موسیٰ کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ مجبور دکھاتے ہیں
یا جادو، بلکہ خطاب فرعون اور اس کے درباریوں سے تھا جو انہیں جادو گر قرار دے رہے تھے۔

۶۲۔ یعنی اُس کے مجرموں کو جادو اور اس کے پیغمبر کو ساحر کہنا نہ قرار دو۔

۶۳۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنی کزوری کو خود محسوس کر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ
حضرت موسیٰ نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے اس مقابلے میں ڈرتے اور اچھکاتے ہوئے آئے
تھے، اور جب عین موقع پر حضرت موسیٰ نے ان کو لٹکار کر سنبھلایا تو ان کا عزم یکایک منترزل ہو گیا۔ ان کا اختلاف رائے
اس امر میں ہوا جو گا کہ آیا اس بڑے تنہوار کے موقع پر جبکہ پورے ملک سے آئے ہوئے آدمی اکٹھے ہیں، کھلے میدان اور دن
کی پوری روشنی میں یہ مقابلہ کرنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر یہاں ہم شکست کھا گئے اور سب کے سامنے جادو اور مجرموں کے
فرق کھل گیا تو پھر بات سنبھالنے نہ سنبھل سکے گی۔

۶۴۔ اور یہ کہنے والے لازماً فرعون یا رٹی کے وہ سر بھرے لوگ ہوں گے جو حضرت موسیٰ کی مخالفت
میں ہر بازی کھیل جانے پر تیار تھے۔ جماندیدہ اور معاملہ فہم لوگ قدم آگے بڑھانے ہوئے جھمک رہے ہوں گے۔
اور یہ سر بھرے جو شیٹلے لوگ کہتے ہوں گے کہ خواہ مخواہ کی دورانہ ریشیاں چھوڑ دو اور جی کڑا کر کے مقابلہ کر ڈالو۔

يُخْرِجُكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثَلَىٰ ﴿٤٣﴾
 فَاجْمَعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ اتُّوْا صَفًّا وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَىٰ ﴿٤٤﴾
 قَالُوا يُمُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقَىٰ وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَلْقَىٰ ﴿٤٥﴾ قَالَ
 بَلْ أَتَقُوْنَ إِذَا جَاءَهُمْ وَعَصِيَّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِمْ مِنْ سُحْرِهِمْ أَنَّهُمَا
 تَسْعَىٰ ﴿٤٦﴾ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ ﴿٤٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ

زور سے تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی طریق زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ اپنی ساری
 تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور ایک کر کے میدان میں آؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا وہی جیت گیا۔

جادو گر بولے، ”موسیٰ تم پھینکتے ہو یا پہلے ہم پھینکیں؟“

موسیٰ نے کہا، ”نہیں، تم ہی پھینکو۔“

یہ ایک اُن کی رستیاں اور اُن کی لائٹیاں اُن کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی
 محسوس ہونے لگیں، اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔ ہم نے کہا ”مت ڈر، تو ہی غالب

۵۳۷ یعنی اُن لوگوں کا دار و مدار دو باتوں پر تھا۔ ایک یہ کہ اگر جادو گر بھی موسیٰ کی طرح لائٹیبوں سے سانبہ بنا کر دکھادیں گے
 تو موسیٰ کا جادو گر ہونا مجمع عام میں ثابت ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ تعصبات کی آگ بھڑکا کر حکمران طبقے کو اندھا دھند بنا دیا جانتے
 تھے اور یہ بیخود انہیں دلا رہے تھے کہ موسیٰ کا غالب آجانا تمہارے ہاتھوں سے ملک نکل جانے اور تمہارے مثالی (Ideal) طریق
 زندگی کے ختم ہو جانے کا ہم معنی ہے۔ وہ ملک کے بااثر طبقے کو ڈرا رہے تھے کہ اگر موسیٰ کے ہاتھ اٹھنا آگیا تو یہ تمہاری ثقافت، اور یہ
 تمہارے آرٹ، اور یہ تمہارا حسین و جمیل تمدن، اور یہ تمہاری تفریحات، اور یہ تمہاری خواتین کی آزادیاں (جن کے شاندار نمونے حضرت
 یوسف کے زمانے کی خواتین پیش کر چکی تھیں) معرض وہ سب کچھ جس کے بغیر زندگی کا کوئی مزہ نہیں، غارت ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے
 بعد تو زری ”ملائت“ کا دور دورہ ہو گا جیسے برداشت کرنے سے مرعانا بہتر ہے۔

۵۳۸ یعنی ان کے مقابلے میں متحدہ محاذ پیش کرو۔ اگر اس وقت تمہارے درمیان آپس ہی میں پھوٹ پڑ گئی اور عین
 مقابلے کے وقت مجمع عام کے سامنے یہ پھکچکا ہٹ اور سرگوشیاں ہونے لگیں تو ابھی ہوا اکھڑ جائے گی اور لوگ سمجھ لیں گے کہ تم خود
 اپنے حق پر ہونے کا یقین نہیں رکھتے، بلکہ دلوں میں چوریے ہوئے مقابلے پر آٹے ہو۔

الْأَعْلَى ﴿۶۸﴾ وَالَّذِي مَاتَ فِي يَمِينِكَ تَلَقَّفَ مَا صَنَعُوا لَكُمَا صَنَعُوا كَيْدًا
سُجْرًا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَى ﴿۶۹﴾ فَأَلْقَى السَّحَرَةُ سُجْدًا قَالُوا

رہے گا۔ پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو ننگے جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں یہ تو جادو گر کا فریب ہے، اور جادو گر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، خواہ کسی شان سے وہ آئے۔ آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادو گر سجدے میں گرادیے گئے اور پکار اٹھے

۶۹۔ بیچ کی تفصیل چھوڑ دی گئی کہ اس پر فرعون کی صفوں میں اعتماد بحال ہو گیا اور مقابلہ شروع کرنے کا فیصلہ کر کے جادو گروں کو احکام دے دیے گئے کہ میدان میں اتر آئیں۔

۷۰۔ سورہ اعراف میں بیان ہوا تھا کہ تَلَمَّأَ الْقَوْمُ سَحَرًا اَعْيَنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ ”جب انہوں نے اپنے انچھ پھینکے تو لوگوں کی نگاہوں کو مسور کر دیا اور انہیں دہشت زدہ کر دیا“ (آیت ۱۱۶)۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ اثر صرف عام لوگوں پر ہی نہیں ہوا تھا، خود حضرت موسیٰ بھی سحر کے اثر سے متاثر ہو گئے تھے۔ ان کی صرف آنکھوں ہی نے یہ محسوس نہیں کیا بلکہ ان کے خیال پر بھی یہ اثر پڑا کہ لاشعیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔

۷۱۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جو نبی حضرت موسیٰ کی زبان سے ”پھینکو“ کا لفظ نکلا، جادو گروں نے کیا رنگ اپنی لاشعیاں اور رسیاں ان کی طرف پھینک دیں اور اچانک ان کو یہ نظر آیا کہ سینکڑوں سانپ دوڑتے ہوئے ان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ اس منظر سے فوری طور پر اگر حضرت موسیٰ نے ایک دہشت اپنے اندر محسوس کی ہو تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ انسان بہر حال انسان ہی ہوتا ہے۔ خواہ پغمبر ہی کیوں نہ ہو، انسانیت کے تقاضے اُس سے منگ نہیں ہو سکتے۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ اُس وقت حضرت موسیٰ کو یہ خوف لاحق ہوا ہو کہ مجھ سے اس قدر مشابہ منظر دیکھ کر عوام ضرور فتنے میں پڑ جائیں گے۔

اس مقام پر یہ بات لائق ذکر ہے کہ قرآن جہاں اس امر کی تصدیق کر رہا ہے کہ عام انسانوں کی طرح پغمبر بھی جادو سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ جادو گر اس کی نبوت سلب کر لینے، یا اس کے اوپر نازل ہونے والی وحی میں غلط ڈال دینے، یا جادو کے اثر سے اس کو گمراہ کر دینے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن فی الجملہ کچھ دیر کے لیے اس کے قومی پر یک گونہ اثر ضرور ڈال سکتا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی کھل جاتی ہے جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کی روایات پڑھ کر نہ صرف اُن روایات کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تمام حدیثوں کو ناقابل اعتبار ٹھیرانے لگتے ہیں۔

۷۲۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے جو آواز ہا پیدا ہوا تھا وہ ان تمام لاشعیوں اور رسیوں ہی کو نکل گیا ہو جو سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن جن الفاظ میں یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں اس واقعے کو بیان کیا گیا ہے اُن سے بظاہر گمان ہی ہوتا ہے کہ اس نے لاشعیوں اور رسیوں کو نہیں نکلا بلکہ اُس جادو کے اثر کو باطل کر دیا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آ رہی تھیں۔ سورہ

أَمَّا يَرْبِ هَارُونَ وَمُوسَى ۝ قَالَ آمَنْتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ أَدْنِ لَكُمْ آتَاةً

”مان لیا ہم نے ہارون اور موسیٰ کے رب کو۔“

فرعون نے کہا ”تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں معلوم

اعراف اور شعر او میں الفاظ یہ ہیں کہ تَلَقَّفْ مَا يَأْتِي الْكُلُونَ، جو جھوٹ وہ بنا رہے تھے اس کو وہ نکلے جا رہا تھا اور یہاں الفاظ یہ ہیں کہ تَلَقَّفْ مَا صَنَعُوا، وہ نکل جائے گا اس چیز کو جو انہوں نے بنا رکھی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ان کا جھوٹ اور ان کی بناوٹ لاشعیاں اور رسیاں نہ تھیں بلکہ وہ جادو تھا جس کی بدولت وہ سانپ بنی نظر آرہی تھیں۔ اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ جدھر جدھر وہ گیا لاشعیاں اور رسیوں کو نکل کر اس طرح پیچھے پھینکنا چلا گیا کہ ہر لاشعی، لاشعی اور ہر رسی، رسی بن کر پڑی رہ گئی۔

۱۰۲ یعنی جب انہوں نے عصائے موسیٰ کا کارنامہ دیکھا تو انہیں فوراً یقین آ گیا کہ یہ یقیناً معجزہ ہے، مان کے فن کی چیز ہرگز نہیں ہے، اس لیے وہ اس طرح یکبارگی اور بے ساختہ سجدے میں گرے جیسے کسی نے اٹھا اٹھا کر ان کو گرادیا ہو۔

۱۰۴ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں سب کو معلوم تھا کہ یہ مقابلہ کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔ پورے مجمع میں کوئی بھی اس غلط فہمی میں نہ تھا کہ مقابلہ موسیٰ اور جادوگروں کے کرتب کا ہو رہا ہے اور فیصلہ اس بات کا ہونا ہے کہ کس کا کرتب زبردست ہے۔ سب یہ جانتے تھے کہ ایک طرف موسیٰ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ، خالق زمین و آسمان کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور اپنی پیغمبری کے ثبوت میں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کا عصا معجزہ سے کے طور پر فی الواقع اثر دہا بن جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جادوگروں کو برسر عام بلا کر فرعون یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عصا سے اثر دہا بن جانا معجزہ نہیں ہے بلکہ محض جادو کا کرتب ہے۔ بالفاظ دیگر، وہاں فرعون اور جادوگر اور سارے تماشاخی عوام و خواص معجزے اور جادو کے فرق سے واقف تھے اور امتحان اس بات کا ہو رہا تھا کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ جادو کی قسم سے ہے یا اُس معجزے کی قسم سے جو رب العالمین کی قدرت کے کرشمے کے سوا اور کسی طاقت سے نہیں دکھایا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو کو مغلوب ہونے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ ”ہم نے مان لیا، موسیٰ ہم سے زیادہ باکمال ہے،“ بلکہ انہیں فوراً یقین آ گیا کہ موسیٰ واقعی اللہ رب العالمین کے پیغمبر ہیں اور وہ پکار اُٹھے کہ ہم اُس خدا کو مان گئے جس کے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ اور ہارون آئے ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مجمع عام پر اس شکست کے کیا اثرات پڑے ہوں گے، اور پھر پورے ملک پر اس کا کیسا زبردست اثر ہو گا۔ فرعون نے ملک کے سب بڑے مرکزی میلے میں یہ مقابلہ اس امید پر کرایا تھا کہ جب مصر کے ہر گوشے سے آئے ہوئے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ جائیں گے کہ لاشعی سے سانپ بنا دینا موسیٰ کا کوئی نرا لاکمال نہیں ہے، ہر جادوگر یہ کرتب دکھالیتا ہے، تو موسیٰ کی ہوا اگھڑ جائے گی۔ لیکن اس کی یہ تدبیر اسی پر اُلٹ پڑی، اور قریہ قریہ سے آئے ہوئے لوگوں کے

لِكَيْبُرِكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَا قَطْعَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ
مِّنْ خِلَافٍ وَلَا وَصْلَ بَنَاتِكُمْ فِي جُدُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا
أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَى ۝ قَالَُوا لَنْ نُؤْتِيَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيْتِ

ہو گیا کہ یہ تمہارا گروہ ہے جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی۔ اچھا، اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دیتا ہوں۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر پا ہے، (یعنی میں تمہیں زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰ)۔

جادوگروں نے جواب دیا "قسم ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا

سامنے خود جادوگروں ہی نے بالافتقار اس بات کی تصدیق کر دی کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ ان کے فن کی چیز نہیں ہے یہ فی الواقع معجزہ ہے جو صرف خدا کا پیغمبر ہی دکھا سکتا ہے۔

۵۷ سورہ اعراف میں الفاظ یہ ہیں اِنَّ هٰذَا الْمَلِكُ مَكْرُوْمٌ وَّ فِي الْمَدْيَنَةِ لَشَيْخِرٌ جُوْا مِنْهَا اَهْلُهَآءُ، یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے دارالسلطنت میں ملی بھگت کر کے کی ہے تاکہ سلطنت سے اس کے مالکوں کو بے دخل کر دوں، یہاں اس قول کی مزید تفصیل یہ دی گئی ہے کہ تمہارے درمیان صرف ملی بھگت ہی نہیں ہے، بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ تمہارا سردار اور گروہ ہے، تم نے معجزے سے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ اپنے استاد سے جادو میں شکست کھائی ہے، اور تم آپس میں یہ طے کر کے آئے ہو کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت کر کے اور اسے اُس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں سیاسی انقلاب برپا کر دو۔

۵۸ یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں۔

۵۹ صلیب یا سولی دینے کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ ایک لمبا شہتیر سا لے کر زمین میں گاڑ دیتے تھے، یا کسی پرانے درخت کا تن اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے، اور اس کے اوپر کے سرے پر ایک تختہ آڑا کر کے باندھ دیتے تھے۔ پھر مجرم کو اوپر چڑھا کر اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلا کر آڑے تختے کے ساتھ کیلیں ٹھونک دیتے تھے۔ اس طرح مجرم تختے کے بل لٹکا رہتا تھا اور گھنٹوں سسک سسک کر جان دے دیتا تھا۔ صلیب دیے ہوئے یہ مجرم ایک مدت تک یونہی لٹکے رہنے دیے جاتے تھے تاکہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر سبق حاصل کریں۔

۶۰ یہ ہری ہوئی بازی جیت لینے کے لیے فرعون کا آخری داؤں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جادوگروں کو انتہائی خوفناک سزا سے ڈرا کر ان سے یہ اقبال کرائے کہ واقعی یہ ان کی اور موسیٰ علیہ السلام کی ملی بھگت تھی اور وہ ان سے مل کر

وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ
الدُّنْيَا ﴿۴۲﴾ إِنَّا أُمَّتًا يَرْبِنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطِيئَاتِنَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْكَ
مِنَ السِّحْرِ وَاللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى ﴿۴۳﴾ إِنَّهُ مِنْ بَيِّنَاتِ رَبِّهِ مُجِزٌ مَا فَإِنَّ
لَهُ جَهَنَّمَ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ﴿۴۴﴾ وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ
عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَى ﴿۴۵﴾ جَعَلْتُ عَدْنٍ

النبیة

کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں تو جو کچھ کرنا چاہے کرے۔
تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ
ہماری خطائیں معاف کرے اور اس جادو گر میٹھے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اللہ
ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔ — حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر
ہوگا اُس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ جیسے گانہ مرے گا۔ اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے
حاضر ہوگا جس نے نیک عمل کیے ہوں گے ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں، سدا بہار باغ ہیں

سلطنت کے خلاف سازش کر چکے تھے۔ مگر جادو گروں کے عزم و استقامت نے اُس کا یہ داؤں بھی اُلٹ دیا۔ انہوں نے
اتنی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہو کر دنیا بھر کو یہ یقین دلادیا کہ سازش کا الزام محض بگڑی ہوئی بات بنانے
کے لیے ایک بے شرمانہ سیاسی چال کے طور پر گھڑا گیا ہے، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ سچے دل سے موسیٰ علیہ السلام
کی نبوت پر ایمان لے آئے ہیں۔

﴿۴۹﴾ دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے: ”یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم اُن روشن نشانیوں کے مقابلے میں
جو ہمارے سامنے آچکی ہیں، اور اس ذات کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تجھے ترجیح دیں۔“

﴿۵۵﴾ یہ جادو گروں کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا اضافہ ہے۔ انداز کلام خود تیار رہا ہے کہ یہ عبارت جادو گروں
کے قول کا حصہ نہیں ہے۔

﴿۵۷﴾ یعنی موت اور زندگی کے درمیان فلک تار ہے گا۔ نہ موت اُسے گی کہ اُس کی تکلیف اور مصیبت کا خاتمہ کر دے۔
اور نہ جینے کا ہی کوئی لطف اسے حاصل ہوگا کہ زندگی کو موت پر ترجیح دے سکے۔ زندگی سے بیزار ہوگا، مگر موت نصیب نہ
ہوگی۔ مرنا چاہے گا مگر نہ سکے گا۔ قرآن مجید میں دوزخ کے عذابوں کی جتنی تفصیلات دی گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ خوفناک



تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۗ وَذَلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّى ۝٤٧
 وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اسْرِبْ بِعِبَادِي فَأَضْرِبْ لَهُمُ طَرِيقًا فِي
 الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفُ دَرَكًا وَلَا يَخْشَى ۝٤٨ فَاتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ
 فَغَشِيَهُمْ مِنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝٤٩ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَهْدَى ۝٥٠

جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی
 اختیار کرے۔ ۴۷

ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور اُن کے لیے
 سمندریں سے سوکھی سڑک بنائے، تجھے کسی کے تعاقب کا ڈرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے پتھروں سے
 گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔

پچھلے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندراُن پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق
 تھا۔ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی۔ ۴۸

صورت غلاب یہی ہے جس کے تصور سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔

۵۱ بیچ میں اُن حالات کی تفصیل چھوڑ دی گئی ہے جو اس کے بعد مصر کے طویل زمانہ قیام میں پیش آئے۔ ان
 تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ اعراف رکوع ۱۵-۱۶، سورۃ یونس رکوع ۹، سورۃ مومن رکوع ۲ تا ۵، اور سورۃ
 زخرف رکوع ۵۔

۵۲ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرمادی جس میں تمام اسرائیلی اور غیر
 اسرائیلی مسلمانوں کو جن کے لیے ”میرے بندوں“ کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے (مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے
 نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں نہریں
 موجود نہ تھیں۔ بحرا حمر سے بحر دم (میڈیٹیرینین) تک کا پورا علاقہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں
 لگیں جن سے ہجرت نہیں گزرا جاسکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ نے بحرا حمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالباً ان کا
 خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے چل کر جزیرہ منائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اُدھر سے فرعون ایک لشکر عظیم لے کر
 تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اس موقع پر آپہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۃ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ ماجریں

کا قافلہ لشکر فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ، "اپنا عصا سمندر پر مار"، فَانْفَلَتَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالضَّوَادِ الْعَظِيمِ، "فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا" اور بیچ میں صرف ہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا پھٹنا، اور یہی آیت کے مطابق منحنی ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے اور اس سکان لوگوں کے بیان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بجائے کی وجہ سے سمندر پھٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا، اور بیچ کا حصہ سوکھ کر سڑک کی طرح نہیں بن جاتا مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم الشعراء، حاشیہ ۷۷-۷۸۔

۵۴ سورہ شعراء میں بیان ہے کہ ماہرین کے گزرنے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اتر آیا (آیات ۶۳-۶۴)۔ یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے کہ نبی اسرائیل سمندر کے دوسرے کنارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ (آیت ۵۰) اور سورہ بقرہ میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکارا اٰمَنْتُ اِنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْا اِسْرٰٓئِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، "میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اس خدا کے سوا جس پر نبی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں" مگر اس آخری لمحہ کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا اَنْتُمْ وَاَنْتُمْ وَاَنْتُمْ قَدْ عَصَيْتُمْ قَبْلَ وَكُنْتُمْ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ، "تو تم نے پہلے ہی گنہگار کیا تھا، آج تم میری لاش کو بچائے لیتے ہیں تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنا رہے" آیات ۹۰-۹۲۔

۵۵ بڑے لطیف انداز میں کفار مکہ کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے سردار اور لیڈر بھی تم کو اسی راستے پر لیے جا رہے ہیں جس پر فرعون اپنی قوم کو لے جا رہا تھا۔ اب تم خود دیکھ لو کہ یہ کوئی صحیح رہنمائی نہ تھی۔

اس قصے کے خاتمے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے بیانات کا بھی جائزہ لے لیا جائے تاکہ ان لوگوں کے جھوٹ کی حقیقت کھل جائے جو کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ قصہ نبی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔ بائبل کی کتاب خروج (Exodus) میں اس قصے کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کے حسب ذیل اجزاء قابل توجہ ہیں:

(۱) باب ۴، آیت ۲-۵ میں بتایا گیا ہے کہ عصا کا معجزہ حضرت موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ اور آیت ۷ میں انہی کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "تو اس لاشیٰ کو اپنے ہاتھ میں لیے جا اور اسی سے ان معجزوں کو دکھانا" مگر آگے جا کر یہ معلوم یہ لاشیٰ کس طرح حضرت ہارون کے قبضے میں چلی گئی اور وہی اس سے معجزے دکھانے لگے۔ باب ۷ سے لے کر بعد کے ابواب میں مسلسل ہم کو حضرت ہارون ہی لاشیٰ کے معجزے دکھاتے نظر آتے ہیں۔

(۲) باب ۵ میں فرعون سے حضرت موسیٰ کی پہلی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، اور اس میں سر سے اُس بحث کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت کے مسئلے پر اُن کے اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی۔ فرعون کہتا ہے کہ "خداوند کون ہے کہ میں اُس کی بات مانوں اور نبی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا"

مگر حضرت موسیٰ اور ہارون اس کے سوا کچھ جواب نہیں دیتے کہ ”عزرائیل کا خدا ہم سے ملا ہے“ (باب ۵- آیت ۲-۳)۔

(۳) جادو گردن سے مقابلے کی پوری داستان میں ان چند فقرہ میں سمیٹ دی گئی ہے
 ”اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ جب فرعون تم کو کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ تو ہارون سے کہنا کہ
 اپنی لاشی کو لے کر فرعون کے سامنے ڈال دے تاکہ وہ سانپ بن جائے۔ اور موسیٰ اور ہارون ان فرعون کے
 پاس گئے اور انہوں نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا اور ہارون نے اپنی لاشی فرعون اور اس کے
 خادموں کے سامنے ڈال دی اور وہ سانپ بن گئی۔ تب فرعون نے بھی داناؤں اور جادو گردن کو
 بلوایا اور مھر کے جادو گردن نے بھی اپنے جادو سے ایسا ہی کیا۔ کیونکہ انہوں نے بھی اپنی اپنی لاشی
 سامنے ڈالی اور وہ سانپ بن گئیں۔ لیکن ہارون کی لاشی ان کی لاشیوں کو نکل گئی“۔ (باب ۷-
 آیت ۸-۱۲)

اس بیان کا مقابلہ قرآن کے بیان سے کر کے دیکھ لیا جائے کہ قصے کی ساری روح بیان کس بڑی طرح نکالی گئی ہے۔
 سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جن دن کے دن کھلے میدان میں باقاعدہ چیلنج کے بعد مقابلہ ہونا، اور پھر شکست کے بعد
 جادو گردن کا اعلان لانا جو قصے کی اصل جان تھا، سرے سے بیان مذکور ہی نہیں ہے۔

(۴) قرآن کتنا ہے کہ حضرت موسیٰ کا مطالبہ نبی اسرائیل کی رہائی اور آزادی کا تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ
 مطالبہ صرف یہ تھا ”ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیابان میں جا کر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں؟“
 (باب ۵- آیت ۳)۔

(۵) مھر سے نکلنے اور فرعون کے غرق ہونے کا مفصل حال باب ۱۱ سے ۱۴ تک بیان کیا گیا ہے۔ اس میں
 بہت سی مفید معلومات، اور قرآن کے اجمال کی تفصیلات بھی ملتی ہیں اور ان کے ساتھ متعدد عجیب باتیں بھی مثلاً
 باب ۱۴ کی آیات ۱۵-۱۶ میں حضرت موسیٰ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ”تو اپنی لاشی رہی ہاں، اب لاشی حضرت ہارون سے لے کر
 پھر حضرت موسیٰ کو دے دی گئی ہے) اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ
 میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے، لیکن آگے چل کر آیت ۲۱-۲۲ میں کہا جاتا ہے کہ ”پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر
 بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پور بنی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے بٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا
 اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا تا یہ
 بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیا یہ معجزہ تھا یا طبعی واقعہ؟ اگر معجزہ تھا تو عصا کی ضرب سے ہی رونما ہو گیا ہوگا، جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے۔
 اور اگر طبعی واقعہ تھا تو یہ عجیب صورت ہے کہ مشرقی آندھی نے سمندر کو بیچ میں سے پھاڑ کر پانی کو دونوں طرف دیوار کی طرح کھڑا کر دیا
 اور بیچ میں سے خشک راستہ بنا دیا۔ کیا فطری طریقے سے ہوا کبھی ایسے کرشمے دکھاتی ہے؟

تلمود کا بیان نسبتاً بائبل سے مختلف اور قرآن سے قریب تر ہے، مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے صاف محسوس
 ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ براہ راست، علم وحی کی بنا پر واقعات بیان کیے جا رہے ہیں، اور دوسری جگہ صدیوں کی سینہ سینہ

يَبْنِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَفْجَيْتَكُم مِّنْ عَدْوِكُمْ وَوَعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ
الْأَيْمَنِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ ۗ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ

اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کے دائیں جانب تمہاری
حاضری کے لیے وقت مقرر کیا اور تم پر من و سلویٰ آمارا۔ کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور

ردایات میں واقعات کی صورت اچھی خاصی مسخ ہو گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

The Talmud Selections, H. Polano, pp. 150-54

۵۴۔ سند رکوع ۱۶ سے لے کر کوہ سینا کے دامن میں پہنچنے تک کی داستان بیچ میں چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلاً
سورۃ اعراف رکوع ۱۶۔ ۱۷ میں گزر چکی ہیں۔ اور وہاں یہ بھی گزر چکا ہے کہ مہر سے نکلنے ہی بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے ایک مندر
کو دیکھ کر اپنے لیے ایک بناوٹی خدا مانگ بیٹھے تھے (تفہیم القرآن۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۹۸)
۵۵۔ یعنی طور کے مشرقی دامن میں۔

۵۵۔ سورۃ بقرہ رکوع ۱۶، اور سورۃ اعراف رکوع ۱۷ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو شریعت
کا ہدایت نامہ عطا کرنے کے لیے چالیس دن کی میعاد مقرر کی تھی جس کے بعد حضرت موسیٰ کو پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے
احکام عطا کیے گئے۔

۵۹۔ من و سلویٰ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول البقرہ، حاشیہ ۷۳۔ الاعراف، حاشیہ ۱۱۹۔
بائبل کا بیان ہے کہ مہر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشت سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک
کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آگئی تھی، اس وقت من و سلویٰ کا نزول شروع ہوا، اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے
تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا (خروج، باب ۱۶۔ گنتی باب ۱۱، آیت ۷۔ ۹۔ یثوع، باب ۵، آیت ۱۲)۔ کتاب
خروج میں من و سلویٰ کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

”اور یوں ہوا کہ شام کو انہی ٹیپوں میں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس
پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول
گول چیز ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اُسے دیکھ کر اُس
میں کہنے لگے: ”کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے“ (باب ۱۶۔ آیت ۱۲-۱۵)۔

”اور بنی اسرائیل نے اُس کا نام من رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزہ شہد

کے بنے ہوئے پوسٹے کی طرح تھا“ (آیت ۳۱)

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:

لَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي وَمَنْ يَحِلُّ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ ﴿٨١﴾ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ ﴿٨٢﴾ وَمَا أَجْعَلُكَ عَنْ قَوْمِكَ يَمُوسَىٰ ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ أَوْلَىٰ عَلَيَّ إِثْرِي وَجِئْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ﴿٨٤﴾ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ

اسے کھا کر سرکشی نہ کرو، ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا۔ اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا۔ البتہ جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے، اس کے لیے میں بہت درگزر کرتے والا ہوں۔

اللہ اور کیا چیز تمہیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰ؟

اُس نے عرض کیا ”وہ بس میرے پیچھے آہی رہے ہیں۔ میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں اسے میرے رب، تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔“

فرمایا ”اچھا، تو سنو، ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا

”لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرنے اور اسے چلی میں پینے یا ادھلی میں کوٹ لیتے تھے۔ پھر اُسے

بانڈیوں میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ نیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں

ادس پڑتی تو اس کے ساتھ من بھی گرتا تھا“ (باب السآیت ۸-۹)

یہ بھی ایک مجبورہ تھا کیونکہ ہم برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بیروں کی وہ کثرت ہے، نہ من ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے جہاں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے، ہم سال تک دشت لنوردی کی تھی، من اُن کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بیوقوف بنانے کے لیے من کا حلوا ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔

۴۰ یعنی مغفرت کے لیے چار شرطیں ہیں۔ اول توبہ، یعنی سرکشی و نافرمانی یا شرک و کفر سے باز آ جانا۔ دوسرے،

ایمان، یعنی اللہ اور رسول اور کتاب اور آخرت کو صدق دل سے مان لینا۔ تیسرے عمل صالح، یعنی اللہ اور رسول کی بدایات کے مطابق نیک عمل کرنا۔ چوتھے اہتداء، یعنی راہِ راست پر ثابت قدم رہنا اور پھر غلط راستے پر نہ جا پڑنا۔

۴۱ یہاں سے سلسلہ بیان اُس واقعہ کے ساتھ جڑ جڑتا ہے جو ابھی ادھر بیان ہوا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل سے یہ

وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ

اور سامری نے انہیں گمراہ کر ڈالا۔

موسوی سخت غصتے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اس نے کہا

دعدہ کیا گیا تھا کہ تم طور کے دائیں جانب ٹھہرو، اور چالیس دن کی مدت گزرنے پر تمہیں ہدایت نامہ عطا کیا جائے گا۔

۵۶۲ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو راستے ہی میں چھوڑ کر حضرت موسیٰ اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں آگے چلے گئے تھے۔ طور کی جانب امین میں، جہاں کا وعدہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا، ابھی قافلہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت موسیٰ اکیلے روانہ ہو گئے اور حاضری دے دی۔ اُس موقع پر جو معاملات خدا اور بندے کے درمیان ہوئے ان کی تفصیلات سورہ اعراف رکوع ۷۷ میں درج ہیں۔ حضرت موسیٰ کا دیدار الہی کی استدعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، پھر اللہ کا ایک پہاڑ پر ذرا سی تجلی فرما کر اسے ریزہ ریزہ کر دینا اور حضرت موسیٰ کا ہموش ہو کر گر پڑنا، اس کے بعد پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام عطا ہونا، یہ سب اسی وقت کے واقعات ہیں۔ یہاں ان واقعات کا صرف وہ حصہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے متعلق ہے۔ اس کے بیان سے منقصود کفار مکہ کو یہ بتانا ہے کہ ایک قوم میں بُت پرستی کا آغاز کس طرح ہوا کرتا ہے اور اللہ کے نبی اس فتنے کو اپنی قوم میں سر اٹھاتے دیکھ کر کیسے بے تاب ہو جایا کرتے ہیں۔

۵۶۳ یہ اس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یاٹے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہر حال کوئی نہ کوئی

نسبت ہی ہے، خواہ قبیلے کی طرف ہو یا نسل کی طرف یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السامری کہہ کر اس کا ذکر کر رہا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں سامری قبیلے یا نسل یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی اس سے زیادہ کوئی تشریح قرآن کے اس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے۔ لیکن یہ مقام اُن اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی شہزادے اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر صرف گیری کی حد کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ، معاذ اللہ، قرآن کے مصنف کی جمالت کا مزین ثبوت ہے، اس لیے کہ دولت اسرائیل کا دارالسلطنت "سامریہ" اس واقعہ کے کئی صدی بعد ۹۲۵ ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا، اور یہودیوں کے ذریعہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بات کی سُن گئی پالی ہوگی، اس لیے اُنہوں نے لے جا کر اس کا تعلق حضرت موسیٰ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش رائج کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔ اسی طرح کی باتیں ان لوگوں نے ہامان کے معاملہ میں بتائی ہیں جسے قرآن فرعون کے

يَقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعَدَّ أَحْسَنَٰهُ أَفْطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ أَمْ
أَرَدْتُمْ أَن يَبْعَلَّ عَلَيْكُمُ غَضَبٌ مِّن سَرِّكُمْ فَآخَلَفْتُم مَّوْعِدِي ﴿۱۷﴾

”اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے، کیا تمہیں دن لگ گئے
ہیں؟ یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟“

ذہری کی حیثیت سے پیش کرنا ہے، اور عیسائی مشنری اور مستشرقین اسے اسخو برس (شاہ ایران) کے درباری امیر ”ہامان“
سے لے جا کر ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک اور ثبوت ہے۔ شاہیدان مدعیان علم و تحقیق
کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا زیادہ اشخاص
یا قبیلہ و مقام ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ شمیری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے دور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی، اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ
حضرت موسیٰ کے عہد میں اس قوم کے، یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اس سامریہ کی
اصل کو بھی دیکھ لیجیے جس کی نسبت سے شمالی نسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ بائبل کا بیان ہے کہ دولت
اسرائیل کے فرمانروا عمری نے ایک شخص ”سمر“ نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا۔
اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام سمر تھا اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا (سلاطین، باب ۱۶ - آیت ۲۷)۔ اس سے صاف
ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے ”سمر“ نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل یا نیلے کا
نام سامری اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔

۱۷۔ اجماع عدہ نہیں کیا تھا، بھی ترجمہ ہو سکتا ہے رشتہ میں جو ترجمہ ہم نے اختیار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آج
تک تمہارے رب نے تمہارے ساتھ جتنی بھلائیوں کا وعدہ بھی کیا ہے وہ سب تمہیں حاصل ہوتی رہی ہیں۔ تمہیں مصر سے نجات
نکالنا، غلامی سے نجات دی، تمہارے دشمن کو تہمتیں لگا کر تمہارے لیے ان صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں سائے اور خوراک کا
بندوبست کیا۔ کیا یہ سارے اچھے وعدے پورے نہیں ہوئے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں شریعت اور ہدایت نامہ
عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، کیا تمہارے نزدیک وہ کسی تیر اور بھلائی کا وعدہ نہ تھا؟

۱۸۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”کیا وعدہ پورا ہونے میں بہت دیر لگ گئی کہ تم نے مصر ہو گئے؟ پہلے ترجمے
کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر اللہ تعالیٰ ایسی ایسی بڑی بڑی احسانات کر چکا ہے، کیا ان کو کچھ بہت زیادہ مدت گزر گئی ہے کہ تم
انہیں قبول گئے؟ کیا تمہاری مصیبت کا زمانہ بیٹے قرین گزر چکی ہیں کہ تم سر مست ہو کر بکٹنے لگے؟ دوسرے ترجمے کا مطلب
صاف ہے کہ ہدایت نامہ عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کے وفا ہونے میں کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی ہے جس کو تم
اپنے لیے عذر اور بہانہ بنا سکو۔

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حَمَلْنَا أَوْزَارًا مِّنْ زِينَةِ
الْقَوْمِ فَقَدْ فَتَنَّاكَ أَتَى السَّاهِرِينَ ﴿۵۶﴾ فَأَخْرَجَ لَهُمْ جِجَادًا

انہوں نے جواب دیا ”ہم نے آپ کے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ
لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لگ گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا“۔ پھر
اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک پھرے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے

۵۶۶ اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ہر قوم اپنے نبی سے کرتی ہے۔ اس کے اتباع کا وعدہ۔ اس کی دی ہوئی ہدایت پر
ثابت قدم رہنے کا وعدہ۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنے کا وعدہ۔

۵۶۷ یہ ان لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے تقے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم نے زیورات پھینک دیے
تھے۔ نہ ہماری کوئی نیت بچھڑانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ تھا ہی کچھ ایسا
کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

”لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لگ گئے تھے“ اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے
مصر کی رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحراوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان
تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی
عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگے کوٹے لیے تھے اور اس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لوٹ کر راتوں
رات ”ہجرت“ کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اخلاقی کارنامہ صرف اسی حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطور خود اسے انجام دیا
ہوا بلکہ یہ کار خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰ نے ان کو سکھایا تھا، اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے دی تھی۔ بائبل کی
کتاب خروج میں ارشاد ہوتا ہے:

”خدا نے موسیٰ سے کہا..... جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور ان کو کہہ..... کہ
جب تم نکل گے تو خاں ہاتھ نہ لکھو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی پڑوس سے اور اپنے اپنے
گھر کی سہان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو
پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے“ (باب ۳- آیت ۲۲ تا ۲۴)

”اور خداوند نے موسیٰ سے کہا..... سو اب تو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ ان میں سے
ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوس سے سونے چاندی کے زیور لے، اور خداوند نے ان لوگوں پر
مصریوں کو مہربان کر دیا“ (باب ۱۱- آیت ۲-۳)

لَهُمْ حَوَارٌ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَى هَ قَيْسِي ۗ أَفَلَا يَرَوْنَ
 إِلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۗ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۗ (۸۹)
 قَالَ لَهُمْ هَارُونَ مِنْ قَبْلِ يَوْمِ إِذْ مَا قُتِنْتُمْ بِهِ ۗ وَإِنَّ رَبَّكُمُ
 الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَاطِيعُوا أَمْرِي ۗ (۹۰) قَالُوا لَنْ نَسْبِرَ

بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے ”یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا، موسیٰ اسے بھول گیا۔“ کیا وہ
 دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟
 ہارون (موسیٰ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ ”لوگو! تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے
 ہو، تمہارا رب رحمن ہے پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔“ مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ ”ہم تو اسی کی

۸۹ اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے
 مانگ لیے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا انہوں
 نے دیا، سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔ (باب ۱۲- آیت ۲۵-۳۶)

انہوں نے کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا
 ہے اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ (اسی لوٹ کا بوجھ تھا۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے ۸۹ اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا، کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب اپنے
 زیورات کو لادے پھرنے سے لوگ تنگ آگئے ہوں گے تو باہم مشورے سے یہ بات قرار پائی ہوگی کہ سب کے زیورات
 ایک جگہ جمع کر لیے جائیں، اور یہ نوٹ کر لیا جائے کہ کس کا کتنا سونا اور کس کی کتنی چاندی ہے، پھر ان کو گلکار اینٹوں اور مسلمانوں
 کی شکل میں ڈھال لیا جائے، تاکہ قوم کے مجموعی سامان کے ساتھ گدھوں اور بیلوں پر ان کو لاد کر چلا جاسکے۔ پھر پانچواں قرار داد کے
 مطابق ہر شخص اپنے زیورات لالاکر ڈھیر میں پھینکتا چلا گیا ہوگا۔

۹۰ یہاں سے پیراگراف کے آخر تک کی عبارت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ قوم کا جواب ”پھینک
 دیا تھا“ پر ختم ہو گیا ہے اور بعد کی یہ تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔ اس سے صورت و انداز یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پیش
 آنے والے فتنے سے بے خبر اپنے اپنے زیور لالاکر ڈھیر کرتے چلے گئے، اور سامری صاحب بھی ان میں شامل تھے۔ بعد میں
 زیور گلانے کی خدمت سامری صاحب نے اپنے ذمے لے لی، اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا مسلمان بنانے کے
 بجائے ایک پچھڑے کی صورت بھیٹی سے برآمد ہوئی جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ اس طرح سامری نے قوم کو دھوکا

عَلَيْهِ عَكِيفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ﴿٩١﴾ قَالَ يَهْرُونَ مَا مَنَعَكَ

پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آجائے۔

موسیٰ اقوام کو ڈانٹنے کے بعد ہارون کی طرف پلٹا اور بولا "ہارون، تم نے جب دیکھا تھا کہ

دیا کہ میں تو صرف سونا لگانے کا تصور دار ہوں، یہ تمہارا خدا آپ ہی اس شکل میں جلوہ فرما ہو گیا ہے۔

۵۶۹ بائبل اس کے برعکس حضرت ہارون پر الزام رکھتی ہے کہ پچھڑا بنانے اور اسے مجبور قرار دینے کا گناہ عظیم

انہی سے سرزد ہوا تھا۔

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنادے جو ہمارے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا۔ ہارون نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ہارون کے پاس لے آئے۔ اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھال بنا پچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل، یہی تیرا دیوتا ہے جو تجھے کو ملک مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کہ ہارون نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہوگی،"

(خروج، باب ۲۲- آیت ۱-۵)

بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارون ہی ہوا اور بعد کے لوگوں نے اس ہارون کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنریوں اور مغربی مستشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن میں بھی ضرور غلطی پر ہے، پچھڑے کو خدا ان کے مقدس نبی نے ہی بنا یا تھا اور ان کے دامن سے اس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ اٹا تصور کیا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال۔ اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں بائبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے بعد نبی لاوی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہ عظیم کیا ہے انہیں قتل کیا جائے، اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اُس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارون کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اس جرم کے بانی مہمانی تھے تو انہیں اس قتل عام سے کس طرح معاف کیا جاسکتا تھا؟ کیا نبی لاوی یہ نہ کہتے کہ موسیٰ، ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہ گار بھائیوں

إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۖ إِلَّا تَتَّبِعَنِ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ۗ قَالَ يَبْتُومِرُ
لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ
بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكُمُ تَرْتُوبُ ۗ قَوْلِي ۙ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَاهِرِي ۙ

یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟

ہارون نے جواب دیا "اے میری ماں کے بیٹے، میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا"

موسیٰ نے کہا "اور سامری تیرا کیا معاملہ ہے؟"

اور ساتھیوں اور بڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے حالانکہ اصل گناہ کا رد ہی تھا، آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ نے خلدند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اس کا نام اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارون کا نام نہ مٹایا گیا بلکہ اس کے برعکس ان کو امدان کی امداد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب یعنی بنی لادی کی سرداری اور عہدہ س کی کمانت سے سرفراز کیا گیا (گنتی باب ۱۸-۱۷ آیت ۱-۷)۔ کہا یا نبیل کی یہ اندلسی شہادت خود اس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے؟

۱۔ حکم سے مراد وہ حکم ہے جو پاپا پر جاتے وقت، اور اپنی جگہ حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی سرداری سونپتے وقت حضرت موسیٰ نے دیا تھا۔ سورہ اعراف میں اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ
اسْتَلْفِنِي يَوْمَ أُصَابُ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ، "اور موسیٰ نے (جاتے ہوئے) اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور دیکھو، اصلاح کرنا، مفسدوں کے طریقے کی پیروی نہ کرنا" (آیت ۱۱۲)۔

۲۔ ان آیات کے ترجمے میں ہم نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ حضرت موسیٰ چھوٹے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے بڑے تھے، اور حضرت ہارون بڑے بھائی تھے مگر منصب کے لحاظ سے چھوٹے تھے۔

۳۔ حضرت ہارون کے اس جواب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قوم کا مجمع رہنا اس کے راہ راست پر رہنے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور اتحاد چاہے وہ شرک ہی پر کیوں نہ ہو، امتزاق سے بہتر ہے خواہ اس کی ناسحق اور باطل ہی کا اختلاف ہو۔ اس

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ
أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ﴿۱۵۰﴾

اس نے جواب دیا ”میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی، پس میں نے رسول کے
نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سمجھایا۔“

آیت کا یہ مطلب اگر کوئی شخص لے گا تو قرآن سے ہدایت کے سہانے گراہی اخذ کرے گا۔ حضرت ہارون کی پوری بات سمجھنے کے لیے اس آیت
کو سورہ اعراف کی آیت ۱۵۰ کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ وہاں وہ فرماتے ہیں کہ اِنَّ اَهْرَانَ الْقَوَّامَ اسْتَضَعَفُونِي وَكَانَ دَا
يَقْتُلُوْنِي رَضًا فَلَا تَسْمِيْتِي الْاَعْدَاءُ وَلَا يَجْعَلُوْا مَعِ الْقَوَّامِ الظَّالِمِيْنَ۔ ”میری ماں کے بیٹے، ان لوگوں نے مجھے
دبا لیا اور تزیب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسے گا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ میں مجھے شمار نہ کرے۔ اب ان دونوں آیتوں
کو جمع کر کے دیکھیے تو صورت واقفہ کی یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ حضرت ہارون نے لوگوں کو اس گراہی سے روکنے کی پوری کوشش کی، مگر
انہوں نے آنجناب کے خلاف سخت فساد مچا کر دیا اور آپ کو مار ڈالنے پر تہل گئے۔ مجبوراً آپ اس اندیشے سے خاموش ہو گئے کہ کہیں
حضرت موسیٰ کے آنے سے پہلے یہاں خانہ جنگی برپا نہ ہو جائے، اور وہ بعد میں اگر شکایت کریں کہ تم اگر اس صورت حال سے عہدہ برآ نہ
ہو کے تھے تو تم نے معاملات کو اس حد تک کیوں بگڑنے دیا، میرے آنے کا انتظار کیوں نہ کیا۔ سورہ اعراف والی آیت کے آخری فقرے
سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قوم میں دونوں بھائیوں کے دشمنوں کی ایک تعداد موجود تھی۔

۱۵۰۔ اس آیت کی تفسیر میں دو گروہوں کی طرف سے عجیب کھینچ تان کی گئی ہے۔

ایک گروہ، جس میں قدیم مفسرین اور قدیم طرز کے مفسرین کی بڑی اکثریت شامل ہے، اس کا یہ مطلب بیان کرتا ہے کہ
”سامری نے رسول یعنی حضرت جبریل کو گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور ان کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھرٹی اٹھالی تھی، اور
یہ اسی مٹھی کی کرامت تھی کہ سب اسے بچھڑے کے بُت پر ڈال گیا تو اس میں زندہ گی پیدا ہو گئی اور جیتنے جاگتے بچھڑے کی سی آواز نکلتی
لگی۔ حالانکہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کی باز پرس کے جواب میں سامری
نے یہ بات بنائی پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مفسرین اس کو ایک امر واقعی، اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت کیسے سمجھ بیٹھے۔

دوسرا گروہ سامری کے قول کو ایک اور ہی معنی پہناتا ہے۔ اس کی تاویل کے مطابق سامری نے دراصل یہ کہا تھا کہ ”مجھے
رسول، یعنی حضرت موسیٰ میں، یا ان کے دین میں وہ کمزوری نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہ آئی۔ اس لیے میں نے ایک حد تک تو اس کے
نقش قدم کی پیروی کی، مگر بعد میں اسے چھوڑ دیا۔ یہ تاویل غالباً سب سے پہلے ابو سلمہ اصفہانی کو سوجھی تھی، پھر امام رازی نے اس کو
اپنی تفسیر میں نقل کر کے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اور اب طرز جدید کے مفسرین بالعموم اسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ لیکن یہ
حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ قرآن سمعوں اور سیلیوں کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے بلکہ صاف اور عام فہم عربی میں
میں نازل ہوا ہے جس کو ایک عام عرب اپنی زبان کے معرود محاورے کے مطابق سمجھ سکے۔ کوئی شخص جو عربی زبان کے معرود

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ

موسیٰ نے کہا "اچھا تو جا" اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھو تا۔ اور

مجادرے اور روزمرہ سے واقف ہو، کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ سامری کے اس مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے عربی میں وہ الفاظ استعمال کیے جائیں گے جو آیت زیر تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔ نہ ایک عام عرب ان الفاظ کو سن کر کبھی وہ مطلب لے سکتا ہے جو یہ حضرات بیان کر رہے ہیں۔ لغت کی کتابوں میں سے کسی نقطہ کے وہ مختلف مفہومات تلاش کر لیں جو مختلف مجادروں میں اس سے مراد لیے جاتے ہوں، اور ان میں سے کسی مفہوم کو لاکر ایک ایسی عبارت میں چسپاں کر دینا جہاں ایک عام عرب اس لفظ کو ہرگز اس مفہوم میں استعمال نہ کرے گا، زبان دانی تو نہیں ہو سکتا، البتہ سخن سازی کا کتب ضرور مانا جا سکتا ہے اس قسم کے کتب فرہنگ آصفیہ یا نغہ میں لے کر اگر کوئی شخص خود ان حضرات کی اردو تحریروں میں، یا آکسفورڈ ڈکشنری لے کر ان کی انگریزی تحریروں میں دکھانے شروع کر دے، تو شاید اپنے کلام کی وہ چار ہی تائیلیں سن کر یہ حضرات چیخ اٹھیں۔ ہاں ہم قرآن میں ایسی تائیلیں اُس وقت کی جاتی ہیں جبکہ ایک شخص کسی آیت کے صاف اور سیدھے مطلب کو دیکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ یہاں تو اللہ میاں سے بڑی بے احتیاطی ہو گئی، لاف میں ان کی بات اس طرح بنا دوں کہ ان کی غلطی کا پردہ ڈھک جائے اور لوگوں کو ان پر ہنسنے کا موقع نہ ملے۔

اس طرز فکر کو چھوڑ کر جو شخص بھی اس سلسلہ کلام میں اس آیت کو پڑھے گا وہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لے گا کہ سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکر و فریب کی اسکیم تیار کی تھی۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تند پیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور سامری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا بلکہ اسی پر مزید جرات بھی کی کہ خود حضرت موسیٰ کے سامنے ایک پڑ فریب داستان گھڑ کر رکھ دی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا، اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقش قدم کی ایک مٹی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبریل ہی ہوں، جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ خود حضرت موسیٰ کے لیے استعمال کیا تھا، تو یہ اس کی ایک اور سکاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰ کو ذہنی رشوت دینی چاہتا تھا، تاکہ وہ اسے اپنے نقش قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھ کر پھول جائیں اور اپنی مزید کراہتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطور واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قیامت لازم آتی ہو اور لغت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کوئی نہ پڑے۔ بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰ نے جس طرح اس کو پھینکا رہا ہے اور اس کے لیے سزا تجویز کی ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گھڑے ہوئے اس پڑ فریب افسانے کو سنتے ہی انہوں نے اس کے منہ پر مار دیا۔

۴۷ یعنی صرف یہی نہیں کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلقات توڑ دیے گئے اور اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا، بلکہ یہ ذمہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور دوسروں سے لوگوں کو

لَكَ مَوْعِدًا لَنْ مُخَلَّفَهُ ۚ وَانظُرْ إِلَى إِلْهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا
لَنْحَرِقْتَهُ ثُمَّ لَنُنْفِقَنَّ فِي أَيْمِنِنَا ۖ إِنَّمَا إِلْهِكُمُ اللَّهُ الَّذِي
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۙ كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ
أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا ۙ مَنْ
أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا ۙ خُلْدِينَ فِيهِ ۙ

تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس پر تو رہجا ہوا
تھا، اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔ لوگو، تمہارا خدا تو بس
ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، ہر چیز پر اُس کا علم حاوی ہے۔

اُسے محمدؐ اس طرح ہم پچھلے گزرے ہوئے حالات کی خبریں تم کو سناتے ہیں، اور ہم نے
خاص اپنے ہاں سے تم کو ایک ”ذکر“ (درس نصیحت) عطا کیا ہے۔ جو کوئی اس سے منہ موڑے گا وہ
قیامت کے روز سخت بارگناہ اٹھائے گا، اور ایسے سب لوگ ہمیشہ اس کے وبال میں گرفتار رہیں گے،

مطلع کرتا رہے کہ میں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائبل کی کتاب اجار میں کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے جو
قواعد بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ:

”اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اُس کے کپڑے پھٹے اور اس کے سر کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے

ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک رہتے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا

اور وہ ہے بھی ناپاک۔ پس وہ اکیلا رہے، اس کا مکان شکر گاہ کے باہر ہو (باب ۱۳- آیت ۴۵-۴۶)

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر اس کو کوڑھ کے مریض میں مبتلا کر دیا گیا ہوگا،

یا پھر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہوگی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مریض لوگوں سے الگ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اس اخلاقی

کوڑھ کے مریض کو بھی الگ کر دیا جائے، اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر بہتر قریب آنے والے کو مطلع کرتا رہے کہ میں

ناپاک ہوں، مجھے نہ چھونا۔

۵۷ مومن علیہ السلام کا قصد ختم کر کے اب پھر تقریر کا رخ اُس مضمون کی طرف مڑتا ہے جس سے سورہ کا آغاز

ہوا تھا۔ اُسے بڑھنے سے پہلے ایک مرتبہ پلٹ کر سورہ کی اُن ابتدائی آیات کو پڑھ لیجیے جن کے بعد یکایک حضرت مومن

وَسَاءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِمْلًا ﴿۱۳۱﴾ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ وَنَحْشُرُ
الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۳۲﴾ يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا

اور قیامت کے دن اُن کے لیے (اس جرم کی ذمہ داری کا بوجھ) بڑا تکلیف دہ بوجھ ہوگا، اُس
دن جبکہ صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں (دہشت کے
مارے) پتھرائی ہوئی ہوں گی، آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ دنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن

کا نفع شروع ہو گیا تھا۔ اس سے آپ کی سمجھ میں اچھی طرح یہ بات آجائے گی کہ سورہ کا اصل موضوع بحث کیا ہے، بیچ بیچ قصہ
موسیٰ کس لیے بیان ہوا ہے، اور اب قصہ ختم کر کے کس طرح تقریر اپنے موضوع کی طرف پلٹ رہی ہے۔

۱۳۱ یعنی یہ قرآن، جس کے متعلق آغاز سورہ میں کہا گیا تھا کہ یہ کوئی اُن ہونا کام تم سے لینے اور تم کو بیٹھے
بٹھائے ایک مشقت میں مبتلا کر دینے کے لیے نازل نہیں کیا گیا ہے، یہ تو ایک یاد دہانی اور نصیحت (تذکرہ) ہے ہر اُس
شخص کے لیے جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو۔

۱۳۲ اس میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ جو شخص اس درس نصیحت، یعنی قرآن سے منہ موڑے گا اور اس کی ہدایت
ورہنمائی قبول کرنے سے انکار کرے گا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بیچنے والے خدا کا کچھ بگاڑ لیکھا
اُس کی یہ حماقت دراصل اس کی خود اپنے ساتھ دشمنی ہوگی۔ دوسری بات یہ بتائی گئی کہ کوئی شخص جس کو قرآن کی یہ نصیحت
پہنچے اور پھر وہ اسے قبول کرنے سے پہلے نہی کرے، اُخترت میں سزا پانے سے بچ نہیں سکتا۔ آیت کے الفاظ عام ہیں کسی
قوم، کسی ملک، کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ جب تک یہ قرآن دنیا میں موجود ہے، جہاں جہاں، جس جس ملک اور قوم
کے، جس شخص کو بھی یہ پہنچے گا، اس کے لیے وہی راستے کھلے ہوں گے۔ تیسرا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ یا تو اس کو ماننے اور اس کی پیروی
اختیار کرے۔ یا اس کو نہ ماننے اور اس کی پیروی سے منہ موڑنے۔ پہلا راستہ اختیار کرنے والے کا انجام آگے آرہا ہے۔ اور دوسرا
راستہ اختیار کرنے والے کا انجام یہ ہے جو اس آیت میں بتا دیا گیا ہے۔

۱۳۳ صور یعنی زنگھا، قرنا، یا بوق۔ آج کل اسی چیز کا قائم مقام بگل ہے جو فوج کو جمع یا منتشر کرنے اور ہدایات
دینے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہ الفاظ اور اصطلاحیں استعمال فرماتا ہے
جو خود انسانی زندگی میں اسی سے ملنے جلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں سان، الفاظ اور اصطلاحوں کے استعمال سے مقصود ہمارے
تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہے، نہ یہ کہ ہم سلطنت الہی کے نظم کی مختلف چیزوں کو بعینہ ان محدود معنوں میں لے لیں،
اور ان محدود صورتوں کی چیزیں سمجھ لیں جیسی کہ وہ ہماری زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے سے آج تک لوگوں کو
جمع کرنے اور اہم باتوں کا اعلان کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی چیز چھوئی جاتی رہی ہے جو صور یا بگل سے جلتی جلتی ہو۔

عَشْرًا ۱۲۳) تَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً

گزارے ہوں گے۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ) اس وقت ان میں سے جو زیادہ سے زیادہ محنت اور اندازہ لگانے والا ہو گا وہ کہے گا کہ

اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت کے روز پھونکی جائے گی جس کی نوعیت ہمارے نزدیک کی سی ہوگی۔ ایک دغورہ پھونکی جائے گی اور سب پر موت طاری ہو جائے گی۔ دوسری دغورہ پھونکنے پر سب جی اٹھیں گے اور زمین کے ہر گوشے سے نکل نکل کر میدانِ حشر کی طرف دوڑنے لگیں گے۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم، الفصل، حاشیہ ۱۰۶

۱۲۴ اصل میں لفظ "دُئِنَا" استعمال ہوا ہے جو "أَسْرَاقِ" کی جمع ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ لوگ خود اُزرق (سفیدی مائل نیلگوں) ہو جائیں گے کیونکہ خوف و دہشت کے مار سے ان کا خون خشک ہو جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ گویا ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں ہے۔ اور بعض دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو اُزرق العین (کرنی کی گھوموں والے) کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ شدتِ ہول سے ان کے دہسے پتھر جھپٹ جائیں گے۔ جب کسی شخص کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے تو اس کے مدقہ چشم کارنگ سفید پڑ جاتا ہے۔

۱۲۵ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "موت کے بعد سے اس وقت تک تم کو مشکل ہی سے دس دن گزارے ہوں گے" قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز لوگ اپنی دنیوی زندگی کے متعلق بھی یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ بہت تھوڑی تھی، اور موت سے لے کر قیامت تک جو وقت گزرا ہو گا اس کے متعلق بھی ان کے اندازہ رکھ ایسے ہی ہوں گے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ دِيسِينَ . قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسَجِّلَ الْعَادِينَ . "اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے ہو، وہ جواب دیں گے ایک دن یا دن کا ایک حصہ رہے ہوں گے، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے" المؤمنون آیات ۱۱۲-۱۱۳۔ دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْكَلُونَ . وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَالْحُكْمُ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ . "اور جس روز قیامت قائم ہو جائے گی تو مجرم لوگ تمہیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم (موت کی حالت میں) ایک گھنٹی بھر سے زیادہ نہیں پڑے رہے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا میں بھی دھوکے کھاتے رہتے تھے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا وہ کہیں گے کہ کتاب اللہ کی رو سے تو تم یوم البعث تک پڑے رہے ہو اور یہ وہی یوم البعث ہے، مگر تم جانتے نہ تھے" الروم آیات ۵۵-۵۶۔ ان مختلف تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی اور برسخ کی زندگی، دونوں ہی کو وہ بہت قلیل سمجھیں گے۔ دنیا کی زندگی کے متعلق وہ اس لیے یہ باتیں کریں گے کہ اپنی امیدوں کے بالکل خلاف جب انہیں آخرت

إِنْ لَيْسَ إِلَّا يَوْمًا ۝ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا

نہیں، تمہاری دنیا کی زندگی بس ایک دن کی زندگی تھی۔ یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں

کہ آخر اس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ کہو کہ میرا رب ان کو دھول بن کر

کی ابدی زندگی میں آنکھیں کھولنی پڑیں گی، اور جب وہ دیکھیں گے کہ یہاں کے لیے وہ کچھ بھی تیاری کر کے نہیں آئے ہیں، تو اتنا درد جہ کی حسرت کے ساتھ وہ اپنی دنیوی زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھیں گے اور کف افسوس ملیں گے کہ چار دن کے لطف و مسرت اور فائدہ و لذت کی خاطر ہم نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاؤں پر کلناڑی ماری۔ موت کے بعد سے قیامت تک کا وقت انہیں اس لیے فقوڑا نظر آنے لگا کہ زندگی بعد موت کو وہ دنیا میں غیر ممکن سمجھتے تھے اور قرآن کے بتائے ہوئے عالم آخرت کا جغرافیہ کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے ذہن میں اتنا ہی تھا۔ یہی تصورات لیے ہوئے دنیا میں احساس و شعور کی آخری ساعت انہوں نے ختم کی تھی۔ اب جو جانک وہ آنکھیں ملنے ہوئے دوسری زندگی میں بیدار ہوں گے اور دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو ایک بگل یا زسٹنگے کی آواز پر ماسج کرتے پائیں گے تو وہ شدید گھبراہٹ کے ساتھ اندازہ لگائیں گے کہ فلاں ہسپتال میں بہوش ہونے یا فلاں جہاز میں ڈوبنے یا فلاں مقام پر حادثہ سے دوچار ہونے کے بعد سے اس وقت تک آخر کتنا وقت لگا ہو گا۔ اُن کی کھوپڑی میں اُس وقت یہ بات سماٹے گی ہی نہیں کہ دنیا میں وہ جاں بحق ہو چکے تھے اور اب یہ وہی دوسری زندگی ہے جسے ہم بالکل لغو بات کہہ کر ٹھٹھوں میں اڑا دیا کرتے تھے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک یہ سمجھے گا کہ شاید میں چند گھنٹے یا چند دن بے ہوش پڑا رہا ہوں، اور اب شاید ایسے وقت مجھے ہوش آیا ہے یا ایسی جگہ اتفاق سے پہنچ گیا ہوں جہاں کسی بڑے حادثہ کی وجہ سے لوگ ایک طرف کو بھاگے جا رہے ہیں۔ بے ہوش نہیں کہ آج کل کے مرنے والے صاحب لوگ صوڑکی آواز کو کچھ دیر تک ہوائی حملے کا ساثرن ہی سمجھتے رہیں۔

۵۱۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو دوران تقریر میں سامعین کے اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے کہ آخر اُس وقت

میدان ہشر میں بھاگتے ہوئے لوگ چپکے چپکے جو باتیں کہیں گے وہ آج یہاں کیسے بیان ہو رہی ہیں۔

۵۲۔ یہ بھی جملہ معترضہ ہے جو دوران تقریر میں کسی سامع کے سوال پر ارشاد ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت

یہ سورت ایک الٹا تقریر کے انداز میں سنائی جا رہی ہوگی اس وقت کسی نے مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال اٹھایا ہو گا کہ قیامت کا جو نقشہ آپ کھینچ رہے ہیں اُس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے لوگ کسی ہموار میدان میں بھاگے چلے جا رہے ہوں گے۔ آخر یہ بڑے بڑے پہاڑ اس وقت کہاں چلے جائیں گے؟ اس سوال کا موقع سمجھنے کے لیے اس ماحولی کو نگاہ میں رکھیے جس میں یہ تقریر کی جا رہی تھی۔ کہ جس مقام پر واقع ہے اس کی حالت ایک حوض کی سی ہے جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں۔ ساحل نے انہی پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کہی ہوگی۔ اور وحی کے اشارہ سے جواب بر ملا اسی وقت یہ دے رہا گیا کہ یہ پہاڑ کوٹ پیٹ کر اس طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے جیسے ریت کے ڈترے، اور ان کو دھول کی طرح اڑا کر

سَرِيٍّ نَسْفًا ۝۱۰۵ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝۱۰۶ لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَ
 لَا أَمْتًا ۝۱۰۷ يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۝۱۰۸ وَخَشَعَتِ
 الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ۝۱۰۹ يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ

اُڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے۔
 اُس روز سب لوگ منادی کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے، کوئی ذرا اکڑ نہ دکھاسکے گا۔ اور
 آوازیں رحمان کے آگے دب جائیں گی، ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سُنو گے۔ اُس روز شفاعت
 ساری زمین ایک ایسا ہموار میدان بنا دی جائے گی کہ اس میں کوئی اونچ نیچ نہ رہے گی، کوئی نشیب و فراز نہ ہوگا، اس کی حالت ایک
 ایسے صاف فرش کی سی ہوگی جس میں ذرا سا بل اور کوئی معمولی سی سلوٹ تک نہ ہو۔

۵۳ عالم آخرت میں زمین کی جو نئی شکل بنے گی اسے قرآن مجید میں مختلف مواقع پر بیان کیا گیا ہے۔ سورہ
 انشقاق میں فرمایا: إِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝۱ زمین پھیلا دی جائے گی۔ سورہ انفطار میں فرمایا: إِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۱
 سمندر بھاڑ دیے جائیں گے، جس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ سمندروں کی نہیں بھٹ جائیں گی اور سارا پانی زمین کے اندر تر جائے گا
 سورہ تکوین میں فرمایا: إِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۱ سمندر بھر دیے جائیں گے یا پاٹ دیے جائیں گے۔ اور یہاں بتایا جا
 رہا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے ساری زمین ایک ہموار میدان کی طرح کر دی جائے گی۔ اس سے جو شکل ذہن میں بنتی ہے
 وہ یہ ہے کہ عالم آخرت میں یہ پورا کرۂ زمین سمندروں کو پاٹ کر، پہاڑوں کو توڑ کر، نشیب و فراز کو ہموار اور جنگلوں کو صاف کر کے بالکل
 ایک گیند کی طرح بنا دیا جائے گا۔ یہی وہ شکل ہے جس کے متعلق سورہ ابراہیم آیت ۴۸ میں فرمایا: يَوْمَ تَبَدَّلَ الْأَرْضُ غَيْرَ
 الْآَرْضِ وَرُءُوسُ الْجِبَالِ مَدْبُورَةٌ ۝۱ اور یہی زمین کی وہ شکل ہوگی جس پر حشر قائم ہوگا اور اللہ تعالیٰ
 علالت فرمائے گا۔ پھر اس کی آخری اور دائمی شکل وہ بنا دی جائے گی جس کو سورہ زمر آیت ۲۱ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقْنَا وَنُفِّرُ كَلِمًا ۝۱ وَأَوْرَثْنَا الْأَرْضَ مَنْ تَابْنَا مِنَ الْجَهَنَّمَ حَيْثُ نَسْنَا ۝۲ فَنَعْمَرُ
 أَجْرًا نَعْمَلِينَ ۝۳ یعنی منقہ لوگ کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے اپنے وعدے پورے کیے اور ہم کو زمین کا وارث
 بنا دیا، ہم اس جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہتر بن اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ۳ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کا
 یہ پورا کرۂ جنت بنا دیا جائے گا اور خدا کے صالح و متقی بندے اس کے وارث ہوں گے۔ اُس وقت پوری زمین ایک ملک
 ہوگی۔ پہاڑ، سمندر، دریا، صحرا، جو آج زمین کو بے شمار ملکوں اور وطنوں میں تقسیم کر رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ انسانیت
 کو بھی بانٹے دے رہے ہیں، سرے سے موجود ہی نہ ہوں گے۔ (دعا صبح رہے کہ صحابہ و تابعین میں سے ابن عباس اور قتادہ
 بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جنت اسی زمین پر ہوگی، اور سورہ نجم کی آیت: عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى ۝۱ عِنْدَ هَا جَنَّةُ الْمَأْدَى

الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَدِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿۱۹﴾ يَعْلَمُ مَا
بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿۲۰﴾ وَعَنْتَ الْوُجُوهُ

کا رگرنہ ہوگی! الایہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات سنا پسند کرے۔ وہ
لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے۔ لوگوں کے سر اس

کی تائید وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ جنت ہے جس میں اب شہداء کی ارواح رکھی جاتی ہیں۔

۱۹ اصل میں لفظ ”ہنس“ استعمال ہوا ہے، جو قدموں کی آہٹ، چکے چکے بولنے کی آواز، اونٹ کے چلنے
کی آواز اور ایسی ہی ہلکی آوازوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی آواز، بجز چلنے والوں کے قدموں کی آہٹ
اور چکے چکے بات کرنے والوں کی کھس کھس کے نہیں سنی جائے گی۔ ایک پر ہیبت سماں بندھا ہوا ہوگا۔

۲۰ اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو متن میں کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس روز شفاعت کا رگرنہ
ہوگی! الایہ کہ کسی کے حق میں رحمان اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہوگا۔ الفاظ ایسے جامع ہیں جو
دونوں مفہوموں پر جاری ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرات نہ ہوگی کجا کوئی سفارش
کے لیے بطور خود زبان کھول سکے۔ سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے، اور اسی کے حق میں کر سکے گا جس
کے لیے بارگاہ الہی سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدد مقامات پر کھول کر تبادلی گئی ہیں۔

ایک طرف فرمایا مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَ اَلَاٰیٰتِ ذٰلِہٖ ، «کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش
کر سکے» (نفرہ - آیت ۲۵۵)۔ اور یَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِکَةُ صَفًّا ، لَا یَتَكَلَّمُونَ اِلَّا مَنْ اٰذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ
وَقَالَ صَوَابًا ، «وہ دن جبکہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے، ذرا بات نہ کریں گے، صرف وہی بول سکے گا جسے

رحمان اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے» (النہا - آیت ۳۸)۔ دوسری طرف ارشاد ہُوَ اَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا بِاِذْنِ
اٰرْتَضٰی وَهُوَ مِنَ حَشِیَّتِہٖ مُّشْفِقُوْنَ ، «اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس شخص کے جس کے حق میں
سفارش سننے پر (رحمان) راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں» (الانبیاء - آیت ۲۸) اور کَحْرَمٰنٍ
مَلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تَعْنٰی شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذِنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُرِضٰی ، «کننے
ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور
ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سنا چاہے اور پسند کرے» (النجم، آیت ۲۶)

۲۱ بیان و عبرت نائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء، کسی کو بھی یہ
معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس سیرت و کردار
اور کبھی کبھی ذمہ داروں کے بارے کر آیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرداروں کا بھی علم ہے

لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ
الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخْفُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

حی و قیوم کے آگے جھک جائیں گے۔ نامراد ہوگا جو اس وقت کسی ظلم کا بارگناہ اٹھائے ہوئے ہو۔ اور کسی ظلم یا سختی تلفی کا خطرہ نہ ہوگا اس شخص کو جو نیک عمل کرے اور اس کے ساتھ وہ مؤمن بھی ہو۔

اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب اس کا موقف کیا ہے۔ نیک ہے تو کیسا نیک ہے اور مجرم ہے تو کس درجے کا مجرم ہے۔ معافی کے قابل ہے یا نہیں۔ پوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء اور صلحاء کو سفارش کی کھلی چھٹی دے دی جائے اور ہر ایک جس کے حق میں جو سفارش چاہے کر دے۔ ایک معمولی انسان اپنے ذرا سے محکمے میں اگر اپنے ہر دست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار دن میں سارے محکمے کا ستیا ناس کر کے رکھ دے گا۔ پھر بھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہوگا، اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بخشو لائیں گے، درانحالیکہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں ان کے نام نہ اعمال کیسے ہیں۔ دنیا میں جو انفر کچھ بھی احساس ذمہ داری رکھتا ہے اس کی مددش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصور دار ماتحت کی سفارش لے کر جاتا ہے تو وہ اس سے کتنا ہے کہ آپ کو شہر نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا کام چور، نا فرض مشناس، رسوت خواہ اور خلق خدا کو تنگ کرنے والا ہے، میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہوں، اس لیے آپ براہ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں۔ اسی چھوٹی سی مثال پر قیاس کر کے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قواعد بیان کیا گیا ہے وہ کس قدر صحیح، معقول اور مبنی بر انصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ نیک بندے، جو دنیا میں خلق خدا کے ساتھ ہمدردی کا بڑا مذا کرنے کے عادی تھے، انہیں آخرت میں بھی ہمدردی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن وہ سفارش کرنے سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی اجازت دے گا صرف اسی کے حق میں وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہوگی کہ وہ مناسب اور مبنی بر حق ہو، جیسا کہ وَقَالَ صَوَابًا (اور بات ٹھیک کہے) کا ارشاد تبارکی صاف بتا رہا ہے۔ بونگی سفارشیں کرنے کی وہاں اجازت نہ ہوگی کہ ایک شخص دنیا میں سینکڑوں، ہزاروں بندگان خدا کے حقوق مارا گیا ہو اور کوئی بزرگ اٹھ کر سفارش کر دیں کہ حضور اسے انعام سے سرفراز فرمائیں یہ میرا خاص آدمی ہے۔

۱۱۱ یعنی وہاں فیصلہ بر انسان کے اوصاف (Merits) کی بنیاد پر ہوگا۔ جو شخص کسی ظلم کا بارگناہ

اٹھائے ہوئے آئے گا، خواہ اس نے ظلم اپنے خدا کے حقوق پر کیا ہو، یا خلق خدا کے حقوق پر، یا خود اپنے نفس پر، ہر حال میں چیز اسے کامیابی کا منہ نہ دیکھنے دے گی۔ دوسری طرف جو لوگ ایمان اور عمل صالح (محض عمل صالح نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح) اور محض ایمان بھی نہیں بلکہ عمل صالح کے ساتھ ایمان) لیے ہوئے آئیں گے، ان کے لیے وہاں نہ تو اس امر کا کوئی

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ
يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعَلَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ
بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور اے محمدؐ، اسی طرح ہم نے اسے قرآن عربی بنا کر نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے تنبیہات کی ہیں شاید کہ یہ لوگ کج روی سے بچیں یا ان میں کچھ ہوش کے آثار اس کی بدولت پیدا ہوں۔
پس بلا ورتے اللہ پادشاہ حقیقی۔

اور دیکھو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کہ جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے، اور دعا کرو کہ اسے پروردگار مجھے مزید علم عطا کرے۔

اندیشہ ہے کہ ان پر ظلم ہوگا، یعنی خواہ مخواہ بے قصور ان کو سزا دی جائے گی، اور نہ اسی امر کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کے کیے کرانے پر پانی پھیر دیا جائے گا اور ان کے جائز حقوق مار کھائے جائیں گے۔

۱۱۳ یعنی ایسے ہی مضامین اور تعلیمات اور نصح سے لبریز۔ اس کا اشارہ ان تمام مضامین کی طرف ہے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، نہ کہ محض قریبی مضمون کی طرف جو ادنیٰ آیات میں بیان ہوا ہے۔ اور اس کا سلسلہ بیان ان آیات سے جڑنا ہے جو قرآن کے متعلق آغاز سورہ اور پھر قصہ موسیٰ کے اختتام پر ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ "تذکرہ" جو تہمدی طرف بھیجا گیا ہے، اور وہ "ذکر" جو ہم نے خاص اپنے ہاں سے تم کو عطا کیا ہے، اس شان کا تذکرہ اور ذکر ہے۔

۱۱۴ یعنی اپنی غفلت سے چونکیں، بھولے ہوئے سبق کو کچھ یاد کوں، اور ان کو کچھ اس امر کا احساس ہو کہ کن بابوں میں بھٹکے چلے جا رہے ہیں اور اس گمراہی کا انجام کیا ہے۔

۱۱۵ اس طرح کے فقرے قرآن میں بالعموم ایک تقریر کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائے جاتے ہیں، اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ کلام کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پر ہو۔ انداز بیان اور سیاق و سباق پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک تقریر ختم ہو گئی ہے اور وَكَلَّمْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ بِالْحَقِّ وَنُوحًا مِمَّا نَزَّلْنَا فِي الْقُرْآنِ عَرَبِيًّا سے دوسری تقریر شروع ہوتی ہے۔ اظہار یہ ہے کہ یہ دونوں تقریریں مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہوں گی اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم الہی کے تحت ان کو ایک سورہ میں جمع کر دیا ہوگا۔ جمع کرنے کی وجہ دونوں کے مضمون کی مناسبت ہے جن کو ابھی ہم واضح کریں گے۔

۱۱۶ فَتَعَلَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ یہ تقریر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد شخصت ہوتے ہوئے فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات پر خبردار کرتا ہے جو وحی نازل کرنے کے دوران میں اس کے مشاہدے میں آئی۔ بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا گیا، اس لیے پیغام کی تزیین مکمل کرنے کے بعد اب وہ اس کا نوٹس لے رہا ہے۔ بات کیا تھی جس پر

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَتَسَىٰ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝۱۱۵

ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا، مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا ۱۱۵

یہ تشبیہ کی گئی، اسے خود تشبیہ کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اسے یاد کرنے اور زبان سے ڈہرانے کی کوشش فرما رہے ہوں گے۔ اس کوشش کی وجہ سے آپ کی توجہ بار بار ریٹ جاتی ہوگی۔ سلسلہ انفرادی میں خلل واقع ہو رہا ہوگا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہوگی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپ کو پیغام وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے، اور بیچ بیچ میں یاد کرنے کی کوشش جو آپ کرتے ہیں اس سے منع کر دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ طہ کا یہ حصہ ابتدائی زمانے کی وحیوں میں سے ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی اخذ وحی کی عادت اچھی طرح نہ پڑی تھی، آپ سے کئی مرتبہ یہ فعل سرزد ہوا ہے اور ہر موقع پر کوئی نہ کوئی فقرہ اس پر آپ کو تشبیہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ سورہ قیامہ کے نزول کے موقع پر بھی یہی ہوا تھا اور اس پر سلسلہ کلام کو توڑ کر آپ کو ٹوکا گیا کہ لَا تَحْزَنْكَ بِهِ، لَسَانًا تَلْفَعْجَلْ بِهِ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَآتِنَهُمْ قُرْآنَهُ، فَيَتْلُوكَ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ، ياد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو بار بار حرکت نہ دو، اسے یاد کرا دینا اور پڑھو ادینا ہمارے ذمہ ہے، لہذا جب ہم اسے سن رہے ہوں تو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ سورہ اعلیٰ میں بھی آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ہم اسے پڑھو ادیں گے اور آپ بھولیں گے نہیں سَتَقْرَأُكَ فَلَا تَنْسَىٰ۔ بعد میں جب آپ کو پیغامات وحی وصول کرنے کی اچھی مہارت حاصل ہو گئی تو اس طرح کی کیفیات آپ پر طاری ہونی بند ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بعد کی سورتوں میں ایسی کوئی تشبیہ ہمیں نہیں ملتی۔

۹۲ جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے، یہاں سے ایک الگ تقریر شروع ہوتی ہے جو اغلباً اور پر والی تقریر کے بعد کسی وقت نازل ہوتی ہے اور مضمون کی مناسبت سے اس کے ساتھ ملا کر ایک ہی سورہ میں جمع کر دی گئی ہے۔ مضمون کی مناسبتیں متعدد ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) وہ بھولا ہوا سبق جسے قرآن یاد دلانا ہے وہی سبق ہے جو نوری انسان کو اس کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا اور جسے یاد دلانے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا، اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار ”ذکر“ آتے رہے ہیں۔

(۲) انسان اُس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھوتا ہے، اور یہ کوزری وہ آغاز آفرینش سے برابر دکھ رہا ہے۔ سب سے پہلے بھول اُس کے اولین ماں باپ کو لاسخ ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس کا سلسلہ برابر جاری ہے، اسی لیے انسان اس کا متخلج ہے کہ اس کو پیغام یاد دہانی کرائی جاتی رہے۔

(۳) یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اُس پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس

”ذکر“ کے ساتھ دہ کرے گا، آغاز آفرینش ہی میں صفات صاف بنا دی گئی تھی۔ آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی ہے کہ اس کی پیروی کرو گے تو گمراہی و بدبختی سے محفوظ رہو گے ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں ہٹلائے مصیبت ہو گے۔

(۴) ایک چیز ہے بھول اور عزم کی کمی اور ارادے کی کمزوری جس کی وجہ سے انسان اپنے انہی دشمن شیطان کے ہکائے میں آجائے اور غلطی کر بیٹھے۔ اس کی معافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویے کی اصلاح کر لے اور انحراف چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز ہے وہ سرکشی اور مرتدانی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی جس کا ارتکاب فرعون اور سامری نے کیا۔ اس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کا انجام وہی ہے جو فرعون اور سامری نے دیکھا اور یہ انجام ہر وہ شخص دیکھے گا جو اس روش پر چلے گا۔

۹۳ آدم علیہ السلام کا قصہ اس سے پہلے سورہ بقرہ، سورہ اعراف (دو مقامات پر)، سورہ حجر، سورہ غی اسرائیل اور سورہ کعب میں گزر چکا ہے۔ یہ سناؤں موقع ہے جبکہ اسے دہرایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ سلسلہ بیان سے اس کی مناسبت الگ ہے اور ہر جگہ اسی مناسبت کے لحاظ سے قصے کی تفصیلات مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔ قصے کے جو اجزاء ایک جگہ کے موضوع بحث سے مناسبت رکھتے ہیں وہ اسی جگہ بیان ہوئے ہیں، دوسری جگہ وہ نہیں گئے، یا طرز بیان ذرا مختلف ہو گا۔ پورے قصے کو اور اس کی پوری معنویت کو سمجھنے کے لیے ان تمام مقامات پر نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ ہم نے ہر جگہ اس کے ربط و تعلق اور اس سے نکلنے والے نتائج کو اپنے حواشی میں بیان کر دیا ہے۔

۹۴ یعنی اُس نے بعد میں اس حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ استکبار اور تصدی و ارادی سرکشی کی بنا پر نہ تھا بلکہ غفلت اور بھول میں پڑ جانے اور عزم و ارادے کی کمزوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس نے حکم کی خلاف ورزی کچھ اس خیال اور نیت کے ساتھ نہیں کی تھی کہ میں خدا کی کیا پردا کرتا ہوں، اس کا حکم ہے تو ہوا کرے، جو کچھ میرا جی چاہے گا کروں گا، خدا کون ہوتا ہے کہ میرے معاملات میں دخل دے۔ اس کے بجائے اس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے ہمارا حکم یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، بھول گیا کہ ہم نے اسے کیا بھیجا تھا، اور اس کے ارادے میں انہی مضبوطی نہ تھی کہ جب شیطان اسے بہکانے آیا اُس وقت وہ ہماری پیشگی تنبیہ اور نصیحت و نمائش کو (جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) یاد کرنا اور اس کے دیے ہوئے لالچ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا۔

بعض لوگوں نے ”اُس میں عزم نہ پایا“ کا مطلب یہ لیا ہے کہ ”ہم نے اس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا“، یعنی اُس نے جو کچھ کیا بھولے سے کیا، نافرمانی کے عزم کی بنا پر نہیں کیا۔ لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو کفر و کذب لَٰكُنْ عَزْمًا عَلٰی الْعَصِيَاكُنْ كَمَا جَانَا نَكَرْ حَضْرًا كُنْ يَحْدُ كُنْ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ نفلان عزم سے مراد اطاعت حکم کے عزم کا نفلان ہے، نہ کہ نافرمانی کے عزم کا نفلان۔ علاوہ بریں اگر موزع و محل اور سیاق و سباق کی مناسبت کو دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہ قہتہ بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنسی اور چھستی رہی ہے۔ مزید

وَاذُقْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ السُّجُودَ وَالْاِلاٰهَ اِبْلِيسَ اَبٰی ﴿۱۱۶﴾
 فَقُلْنَا يَا اٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكَ مَنَا

یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ سب سجدہ کر گئے، مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدم سے کہا کہ دیکھو یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں

براں، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس آیت کو پڑھے گا اس کے ذہن میں پہلا مفہوم ہی آئے گا کہ ہم نے اس میں اطاعت امر کا عزم یا مضبوط ارادہ نہ پایا، دوسرا مفہوم اس کے ذہن میں اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ آدم علیہ السلام کی طرف معصیت کی نسبت کو نامناسب سمجھ کر آیت کے کسی اور معنی کی تلاش شروع نہ کر دے۔ یہی رائے علامہ آلوسی نے بھی اس موقع پر اپنی تفسیر میں ظاہر فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں لکن لا یخفی علیک ان هذا التفسیر غیر متبادرہ ولا کثیر المناسباتہ للمقارنہ، مگر تم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ تفسیر آیت کے الفاظ سن کر فوراً ذہن میں نہیں آتی اور نہ موقع و محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے (ملاحظہ ہو روح المعانی - جلد ۱۶ - صفحہ ۲۴۳)

۹۵۔ یہاں وہ اصل حکم بیان نہیں کیا گیا ہے جو آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، یعنی یہ کہ "اس خاص درخت کا پھل نہ کھانا، وہ حکم دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہو چکا ہے۔ اس مقام پر چونکہ بتانے کی اصل چیز صرف یہ ہے کہ انسان کس طرح اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہ اور فمائش کے باوجود اپنے جانے بوجھے دشمن کے اغوا سے متاثر ہو جاتا ہے، اور کس طرح اس کی بھی کمزوری اس سے وہ کام کر لیتی ہے جو اس کے اپنے مفاد کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اصل حکم کا ذکر کرنے کے بجائے یہاں اُس فمائش کا ذکر کیا ہے جو اس حکم کے ساتھ حضرت آدم کو کی گئی تھی۔

۹۶۔ دشمنی کا مظاہرہ اُسی وقت ہو چکا تھا۔ آدم اور حوا علیہما السلام نمود دیکھ چکے تھے کہ ابلیس نے ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے اور صاف صاف یہ کہہ کر کیا ہے کہ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ، "میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے" (آیت ۱۲ - ص - آیت ۷۶)۔ اَدَايْتِكَ هٰذَا الَّذِي كَرَّمْت عَلَيَّ، "ذرا دیکھ تو سہی، یہ ہے وہ، سننی جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے"۔ وَاسْجُدْ لِسَمٰنٍ خَلَقْتَ طِيْنًا، "اب کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے؟" (بنی اسرائیل - آیات ۶۱ - ۶۲)۔ پھر اتنے ہی پر اس نے اکتفا نہ کیا کہ کھلم کھلا اپنے حسد کا اظہار کر دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس نے مہلت بھی مانگی کہ مجھے اپنی فضیلت اور اس کی نا اہلی ثابت کرنے کا موقع دیجیے، میں اسے بہکا کر آپ کو دکھا دوں گا کہ کیسا ہے یہ آپ کا خلیفہ۔ (اعراف، حجر اور بنی اسرائیل میں اس کا یہ جلیج گزر چکا ہے اور آگے سورہ ص میں بھی آ رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ تمہارا دشمن ہے، تو یہ محض ایک امر غیب کی اطلاع نہ تھی، بلکہ ایک ایسی چیز تھی جسے عین برسر موقع دونوں مہیاں بیوی اپنی آنکھوں دیکھ چکے اور اپنے کانوں سن چکے تھے۔

الْجَنَّةِ فَتَشْقَى ۱۱۷ إِنَّ لَكَ أَلًا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَى ۱۱۸ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَى ۱۱۹ فَوَسَّوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةٍ الْخُلْدِ وَمَلِكٍ لَا يَبُلَى ۱۲۰ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَدَتْ

جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے۔ لیکن شیطان نے اس کو پھسلا یا۔ کہنے لگا ”آدم! بتاؤں تمہیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے؟“ آخر کار دونوں (میاں بیوی) اس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی ان کے ستر

۹۷ اس طرح یہ بھی دونوں کو بتا دیا گیا کہ اگر اس کے بھکائے میں آکر تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تو جنت میں نہ رہ سکو گے اور وہ تمام نعمتیں تم سے چھین جائیں گی جو تم کو یہاں حاصل ہیں۔

۹۸ یہ تشریح ہے اس مصیبت کی جس میں جنت سے نکلنے کے بعد انسان کو مبتلا ہو جانا تھا۔ اس موقع پر جنت کی بڑی اور اکل و افضل نعمتوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس کی چار بنیادی نعمتوں کا ذکر کیا گیا، یعنی یہ کہ میاں تمہارے لیے غذا، پانی، لباس اور مسکن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے، تم کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس سے خود بخود یہ بات آدم و حوا علیہما السلام پر واضح ہو گئی کہ اگر وہ شیطان کے بھکائے میں آکر حکم سرکاری کی خلاف ورزی کریں گے تو جنت سے نکل کر انہیں یہاں کی بڑی نعمتیں تو درکنار یہ بنیادی آسائشیں تک حاصل نہ رہیں گی۔ وہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات تک کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنی جان بچانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ سچوٹی سے اڑتی تک پسینہ جب تک نہ بہائیں گے ایک وقت کی روٹی تک نہ پاسکیں گے۔ محاش کی فکر ہی ان کی توجہ اور ان کے اوقات اور ان کی قوتوں کا اتنا بڑا حصہ کھینچ لے جائے گی کہ کسی بلند تر مقصد کے لیے کچھ کرنے کی نہ فرصت رہے گی نہ طاقت۔

۹۹ یہاں قرآن صاف تصریح کرتا ہے کہ آدم و حوا میں سے اصل وہ شخص جس کو شیطان نے دوسو سے میں ڈالا آدم علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت حوا۔ اگرچہ سورہ اعراف کے بیان کے مطابق مخاطب دونوں ہی تھے اور بھکانے میں دونوں ہی آئے، لیکن شیطان کی دوسو اندازی کا رخ دراصل حضرت آدم ہی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس بائبل کا بیان یہ ہے کہ سانپ نے پہلے عورت سے بات کی اور پھر عورت نے اپنے شوہر کو بھکا کر درخت کا پھل اسے کھلایا (پیدائش، باب ۳)۔

۱۰۰ سورہ اعراف میں شیطان کی گفتگو کی مزید تفصیل ہم کو یہ ملتی ہے وَقَالَ مَا تَهْمِكُمْ رَبِّكُمْ مَا عَنَ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا مَلَائِكَةً أَوْ تَكُونُوا مِنَ الْخَالِدِينَ، اور اس نے کہا کہ تمہارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روک دیا ہے کہ میں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ، یا ہمیشہ جیتے نہ رہو! (آیت ۲۰)

لَهُمَا سَوَاتِيمَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ نُوَعَصَى
 اَدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى ﴿۱۳۱﴾ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى ﴿۱۳۲﴾ قَالَ

ایک دوسرے کے آگے کھل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اس کے رب نے اُسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت بخشی۔ اور فرمایا ”تم دونوں (قرنی) یعنی انسان اور

۱۳۱۔ بالفاظ دیگر نافرمانی کا صدور ہوتے ہی وہ آسائشیں ان سے چھین لی گئیں جو سرکاری انتظام سے ان کو مہیا کی جاتی تھیں، اور اس کا اولین ظہور لباس چھین جانے کی شکل میں ہوا۔ غذا، پانی اور مسکن سے محرومی کی نوبت توجہ کو ہی آتی تھی، اس کا پتہ تو بھوک پیاس لگنے پر ہی چل سکتا تھا، اور مکان سے نکالے جانے کی باری بھی بعد ہی میں آ سکتی تھی۔ مگر پہلی چیز جس پر نافرمانی کا اثر پڑا وہ سرکاری پوشاک تھی جو اسی وقت اُتر والی گئی۔

۱۳۲۔ بیان اُس بشری کمزوری کی حقیقت کو کچھ لینا چاہیے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسائشیں حاصل تھیں ان کا تجربہ انہیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد اور عداوت کا بھی ان کو براہِ راست علم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دینے کے ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ یہ تمہارا دشمن تمہیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا تمہیں یہ نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ شیطان اُن کے سامنے چیلنج دے چکا تھا کہ میں اسے ہکا ڈل گا اور اس کی بیخ کنی کر کے چھوڑ دوں گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جب شیطان نے ان کو نامحسوس اور خیر خواہ و دست کے بھیس میں آ کر ایک بہتر حالت (زندگی) ماواں اور سلطنت (انزال) کا لالچ دلا یا تو وہ اس کی ٹھیکر کے مقابلے میں نہ جم سکے اور پھسل گئے، حالانکہ اب بھی خدا پرمان کے عقیدے میں فرق نہ آیا تھا اور اس کے فرمان کے پاس میں ایسا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ سر سے سے واجب الماذاعان ہی نہیں ہے۔ بس ایک فوری جذبے نے جو شیطان کی تحریک کے زیر اثر ابھرا تھا، ان پر ذہول طاری کر دیا اور ضبط نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔ یہی وہ ”بھول“ اور ”نقدان عزم“ ہے جس کا ذکر فقہ کے آغاز میں کیا گیا تھا، اور اسی چیز کا نتیجہ وہ نافرمانی اور بھٹک ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی وہ کمزوری ہے جو ابتداء سے آفرینش ہی میں اس سے ظاہر ہوئی، اور بعد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جبکہ یہ کمزوری اس میں نہ پائی گئی ہو۔

۱۳۳۔ یعنی شیطان کی طرح رات دن درگاہ نہ کر دیا، اطاعت کی کوشش میں ناکام ہو کر جہاں وہ گر گئے تھے وہیں انہیں پڑا نہیں پھوڑ دیا، بلکہ اُٹھا کر پھر اپنے پاس بلا لیا اور اپنی خدمت کے لیے چمک لیا۔ ایک سلوک وہ ہے جو بالارادہ بناوٹ کرنے والے اور اکتا اور بیکڑی دکھانے والے نوکر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا مستحق شیطان تھا اور ہر وہ بندہ ہے جو ڈٹ کر

أَهْبِطًا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَأَمَّا يَا تَيْتُمُ مِثِّي
هُدًى هُ فَمِنْ اتَّبَعَ هُدَاى فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى ﴿۱۳۳﴾ وَمَنْ أَعْرَضَ
عَنْ ذِكْرِى فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى ﴿۱۳۴﴾

شیطان یہاں سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے
تو جو کوئی میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے ”ذکر“ (درس نصیحت)
سے منہ موڑے گا اُس کے لیے دُنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

اپنے رب کی نافرمانی کرے اور غم ٹھونک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ دوسرا سلوک وہ ہے جو اس دغا دار بندے کے ساتھ
کیا جاتا ہے جو محض ”بھول“ اور ”فقدانِ عزم“ کی وجہ سے قصور کر گزرا ہو، اور پھر ہوش آتے ہی اپنے کیے پر پشیمان ہو جائے۔ یہ
سلوک حضرت آدمؑ سے کیا گیا، کیونکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار اٹھے تھے کہ سَابَتْنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنَّ لَنَا
تَغْوِفًا لَنَا وَتَوَحَّيْنَا لِنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۱ ”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اور اگر تو ہم سے
درگزر نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم برباد ہو جائیں گے“ (اعراف - آیت ۲۳)

۱۳۴ یعنی صحت معاف ہی نہ کیا، بلکہ آئندہ کے لیے راہِ راست بھی تباہی اور اس پر چلنے کا طریقہ بھی سکھایا۔

۱۳۵ دُنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لائن ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ
یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑ پتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اقلیم کا فرمانروا بھی ہوگا تو بے کلی اور بے اطمینانی سے
نجات نہ پائے گا۔ اس کی ذہنی کامیابیاں بیزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر
گرد و پیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی جو اسے کبھی امن و اطمینان اور بھی
مسترت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی۔

۱۳۶ اس جگہ آدم علیہ السلام کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصہ جس طریقے سے یہاں، اور قرآن کے دوسرے مقامات
پر بیان ہوا ہے اس پر غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں (واللہ اعلم بالصواب) کہ زمین کی اصل خلافت وہی تھی جو آدم علیہ السلام کو
ابتداءً جنت میں دی گئی تھی۔ وہ جنت ممکن ہے کہ آسمانوں میں ہو اور ممکن ہے کہ اسی زمین پر بنائی گئی ہو۔ بہر حال وہاں اللہ تعالیٰ
کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمہ تھا اور خدمت گار
(فرشتے) اُس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی، تاکہ وہ خلافت کے
بزرگ تہ اور بلند تر وظائف ادا کرنے کے لیے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر منتقل نقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری
سمجھا گیا تاکہ اُمیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں اور خوبیاں کیا۔ چنانچہ

امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریریں و اطاع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا، اور اس کے علم پر نسبیاں غالب آجاتا ہے۔ اس امتحان کے بعد آدم اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمائشی خلافت دی گئی، اور آزمائش کے لیے ایک مدت (اجل مسمیٰ) جس کا اختتام قیامت پر ہوگا مقرر کر دی گئی۔ اس آزمائش کے دور میں امیدواروں کے لیے معیشت کا سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ اب اپنی معاش کا انتظام انہیں خود کرنا ہے۔ البتہ زمین اور اس کی مخلوقات پر ان کے اختیارات برقرار ہیں۔ آزمائش اس بات کی ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود یہ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں، اور اگر بھول لاسخ ہوتی ہے، یا تحریریں و اطاع کے اثر میں آکر پھسلتے ہیں، تو تنبیہ و تذکیر اور تعلیم کا اثر قبول کر کے سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور ان کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، اطاعت کا یا معصیت کا؟ اس آزمائشی خلافت کے دوران میں ہر ایک کے طرز عمل کا ریکارڈ محفوظ رہے گا۔ اور یوم الحساب میں جو لوگ کامیاب نکلیں گے انہی کو پھر مستقل خلافت، اُس دائمی زندگی اور لازوال سلطنت کے ساتھ جس کا لالچ دے کر شیطان نے حکم کی خلافت و رزی کرائی تھی، عطا کی جائے گی۔ اُس وقت یہ پوری زمین جنت بنا دی جائے گی اور اس کے وارث خدا کے وہ صالح بندے ہوں گے جنہوں نے آزمائشی خلافت میں طاعت پر قائم رہ کر، یا بھول لاسخ ہونے کے بعد بالآخر طاعت کی طرف پلٹ کر اپنی اہمیت ثابت کر دی ہوگی۔ جنت کی اس زندگی کو جو لوگ محض کھانے پینے اور اینڈنے کی زندگی سمجھتے ہیں ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہاں پیہم ترقی ہوگی بغیر اس کے کہ اس کے لیے کسی منزل کا خطرہ ہو۔ اور وہاں خلافت الہی کے عظیم الشان کام انسان انجام دے گا بغیر اس کے کہ اسے پھر کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ مگر ان ترقیات اور ان خدمات کا تصور کرنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک بچے کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ بڑا ہو کر جب وہ شادی کرے گا تو ازدواجی زندگی کی کیفیات کیا ہوں گی۔ اسی لیے قرآن میں جنت کی زندگی کے صرف انہی لفظوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم اس دنیا کی لذتوں پر قیاس کر کے کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آدم و حوا کا قصہ جس طرح بائبل میں بیان ہوا ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ بائبل کا بیان ہے کہ خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نغصوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا۔ اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے رد کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرے گا۔ اور خداوند خدا اُس پہلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا۔ اور آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے اور سانپ گل وشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا، چالاک تھا، اور اس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟ اور سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرے گی بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ چنانچہ عورت نے اس کا پھل لے کر کھایا اور

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَّكَ
اٰیٰتِنَا فَتَسِيْبُهَا ۗ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنٰسِي ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ

وہ کہے گا ”پروردگار! دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟“
اللہ تعالیٰ فرمائے گا ”ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو، جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں، تو نے بھلا دیا
تھا۔ اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے۔“ اس طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے

اپنے شوہر کو بھی کھلایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی
کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں۔ اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سنی اور آدم اور اس کی بیوی
نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ پھر خدا نے آدم کو پکارا کہ تو کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ میں
تیری آواز سن کر ڈرا اور چھپ گیا کیونکہ میں ننگا تھا۔ خدا نے کہا ارے، تجھ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ تو ننگا ہے۔ ضرور تو نے اس
درخت کا پھل کھایا ہو گا جس سے میں نے منع کیا تھا۔ آدم نے کہا کہ مجھے تو نے اس کا پھل کھلایا، اور تو نے کہا مجھے ساڑھے
بھکا یا تھا۔ اس پر خدا نے سانپ سے کہا اس لیے کہ تو نے یہ کیا تو سب چوہا بیوں اور دشتی جانوروں میں لہون ٹھیرا تو اپنے
پیٹ کے بل پٹے گا اور عمر بھر خاک چاٹے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان
عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کھٹے گا اور عورت کو یہ سزا دی کہ وہ میں تیرے دردمل کو مت
بڑھاؤں گا، تو درد کے ساتھ بچھنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا اور
آدم کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور میرے حکم کے خلاف کیا، اس لیے نہ میں تیرے
سبب سے لعنت ہوئی، مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیڑھا رکھاٹے گا..... تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھاٹے گا۔
پھر خداوند نے آدم اور اس کی بیوی کے واسطے چڑھے کے کرتے بنا کر ان کو پہنائے۔ اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان
نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھاٹے اور حیات کے ذوق
سے بھی کچلے کر کھاٹے اور ہمیشہ جینا رہے۔ اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا۔ ”پیداؤش،
باب ۲- آیات ۷-۲۵- باب ۳- آیات ۱-۲۳-“

بائبل کے اس بیان اور قرآن کے بیان کو ذرا وہ لوگ بالمقابل رکھ کر دیکھیں جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرتانے
کہ قرآن میں یہ قہتے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔

۱۳۵ قیامت کے روز نئی زندگی کے آغاز سے لے کر جہنم میں داخل ہونے تک جو مختلف کیفیات مجرب پر گزریں گی
ان کو قرآنی مجید میں مختلف مواقع پر جدا جدا بیان کیا گیا ہے۔ ایک کیفیت یہ ہے: لَقَدْ كُنْتُمْ فِيْ خُلُقٍ وَّحٰشَا لِهٰذَا اَلَمْ تَكْتَفٰ

وَلَمْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِ رَبِّهِ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَى ۝۱۲۷ أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمَا أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْكِنِهِمْ إِنَّ رَبَّكَ يُؤْتِي مَا يَشَاءُ وَيُخْتَارُ ۝۱۲۸

رب کی آیات نہ ماننے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیر پا ہے۔

پھر کیا ان لوگوں کو (تاریخ کے اس سبق سے) کوئی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کی (برباد شدہ) بستنیوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ حقیقت

عَنكَ غَطَاءُكَ بَصْرَكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ، تو اس چیز سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، اب ہم نے تیرے آگے سے پردہ ہٹا دیا ہے، آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے، یعنی تجھے خوب نظر آ رہا ہے (ق-آیت ۲۲)۔ دوسری کیفیت یہ ہے اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِينَ سَاءَ وَسْهَمٌ لَا يَزِيدُ الْإِنَّمَاءَ وَآمِدٌ نَّهُمْ هَوَاءٌ، اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پٹی کی پٹی رکھی ہیں، ہر آنکھ بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اوپر چمی ہیں اور دل ہیں کہ اُڑے جاتے ہیں، ابراہیم-آیت ۴۲، تیسری کیفیت یہ ہے وَخُذْ جَمَلًا لَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا، اِنْفِرْ كِتَابَكَ، کھلی ہوئی کتاب، اَلْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِبًا، اور قیامت کے روز ہم اس کے لیے نیک تر مشورہ نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب پائے گا۔ پڑھ اپنا مشاغل، آج اپنا صاحب گمانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے، (ذی اسرائیل-آیات ۱۲-۱۴)، اور انہی کیفیات میں سے ایک یہ بھی ہے جو آیت زیر بحث میں بیان ہوئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت سے یہ لوگ آخرت کے ہونا ک مناظر اور اپنی شامت اعمال کے نتائج کو تو خوب دیکھیں گے، لیکن بس ان کی بینائی ہی کچھ دیکھنے کے لیے ہوگی۔ باقی دوسری چیزیں تو ان کا حال اندھے کا سا ہو گا جسے اپنا راستہ نظر نہ آتا ہو جو نہ لامٹی رکھنا ہو کہ مثل کرجل کے نہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑے کہ چلانے والا ہو، قدم پر ٹھوکریں کھا رہا ہو، اور اس کو کچھ نہ ہو جتنا ہو کہ کدھر جائے اور اپنی مزدوریات کہاں سے پوری کرے۔ اسی کیفیت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ جس طرح تو نے ہماری آیات کو بٹھا دیا تھا اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے، یعنی آج کوئی پرہیز نہ کی جائے گی کہ تو کہاں کہاں ٹھوکریں کھا کر گرتا ہے اور کیسی کیسی محرمیاں برداشت کر رہا ہے۔ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے گا، کوئی تیری حاجتیں پوری نہ کرے گا، اور تیری کچھ بھی نہ پوری نہ کی جائے گی۔

۱۲۷ اشارہ ہے اس متنگ زندگی کی طرف جو اللہ کے ذکر، یعنی اس کی کتاب اور اس کے پیچھے ہونے میں نصیحت

سے منہ موڑنے والوں کو دنیا میں بہر کرانی جاتی ہے۔

۱۲۸ اشارہ ہے اہل مکہ کی طرف جو اُس وقت مخاطب تھے۔

فِي ذَلِكَ آيَاتٍ لِّأُولِي النَّهْيِ ﴿۱۳۸﴾ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ
 لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۳۹﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ
 قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ
 النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ﴿۱۴۰﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا

اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مُہلت کی ایک مدت
 مقرر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا پس اے محمدؐ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر
 صبر کرو اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب
 ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی
 ہو جاؤ۔ اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو و نہیوی زندگی کی اُس نشان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف

اللہ یعنی تادخ کے اس بہن میں، آثار قدیمہ کے اس مشاہدے میں، نسل انسانی کے اس تجربے میں۔

اللہ یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی ہلاک نہیں کرنا چاہتا، اور ان کے لیے مُہلت کی ایک مدت مقرر کر چکا ہے، اس لیے
 اُس کی دی ہوئی اس مُہلت کے دوران میں یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ کریں اُس کو تمہیں برداشت کرنا ہوگا اور صبر کے ساتھ ان کی تمام
 تلخ و ترش باتیں سنتے ہوئے اپنا فریضہ تبلیغ و تذکیر انجام دینا پڑے گا۔ اس تحمل و برداشت اور اس صبر کی طاقت تمہیں نماز سے ملے گی
 جس کو تمہیں ان اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

”رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح“ کرنے سے مراد نماز ہے، جیسا کہ آگے چل کر خود فرمادیا وَاَهْلًا لَّكَ

بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو۔

نماز کے اوقات کی طرف بیان بھی صاف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز، سورج غروب ہونے سے
 پہلے عصر کی نماز۔ اور رات کے اوقات میں عشاء اور تہجد کی نماز۔ رہے دن کے کناسے، تو وہ نہیں ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک کناسہ صبح
 ہے، دوسرا کناسہ زوال آفتاب، اور تیسرا کناسہ شام۔ لہذا دن کے کناسوں سے مراد فجر، ظہر اور مغرب کی نماز ہی ہو سکتی ہے۔ نیز تفصیلاً
 کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم۔ ہود، حاشیہ ۱۱۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۱ تا ۹۹، جلد سوم، الروم، حاشیہ ۲۲۔ جلد چہارم،

مَنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْسَتِهِمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى ۝۱۳۱
 وَأَهْرَ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا تَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ
 نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى ۝۱۳۲

قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے، اور
 تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو
 اور خود بھی اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے
 ہیں۔ اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا؟

۱۳۱ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنی موجودہ حالت پر راضی ہو جاؤ جس
 میں اپنے مشن کی خاطر تمہیں طرح طرح کی ناگوار باتیں سہنی پڑ رہی ہیں، اور اللہ کے اس فیصلے پر راضی ہو جاؤ کہ تم پر ناخن نظم اور زیادتیاں
 کرنے والوں کو ابھی سزا نہیں دی جائے گی، وہ داعی حق کو ستاتے بھی رہیں گے اور زمین میں زندان تھے بھی پھر میں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ
 تم ذرا یہ کام کر کے تو دیکھو، اس کا نتیجہ وہ کچھ سامنے آئے گا جس سے تمہارا دل خوش ہو جائے گا یہ دوسرا مطلب قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف
 طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں نماز کا حکم دینے کے بعد فرمایا عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّخْمُودًا
 "تو تم ہے کہ تمہارا رب تمہیں تمام محمود پر پہنچا دے گا" آیت ۷۹۔ اور سورہ ضحیٰ میں فرمایا وَكَلَّا لَآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ وَكَ
 لَسَوْفَ يُعْطِيكَ سَرُّكَ فَتَرْضَىٰ، "تمہارے لیے بعد کا دور یقیناً پہلے دور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمہارا رب تمہیں انسا کچھ
 دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔

۱۳۲ رزق کا ترجمہ ہم نے "رزق حلال" کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی حرام مال کو "رزق رب" سے تعبیر نہیں فرمایا ہے۔
 مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور تمہارے ساتھی اہل ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ یہ فساق و فجار ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنی
 زندگی میں جو غنا ہری چمک دمک پیدا کر لیتے ہیں، اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھو۔ یہ دولت اور یہ نشان و نشانات تمہارے لیے ہرگز
 قابل رشک نہیں ہے جو پاک رزق تم اپنی محنت سے کماتے ہو وہ خواہ کتنا ہی ٹھوڑا ہو، راستباز اور ایماندار آدمیوں کے لیے وہی
 بہتر ہے اور اسی میں وہ بھلائی ہے جو دنیا سے آخرت تک برقرار رہنے والی ہے۔

۱۳۳ یعنی تمہارے بال بچے بھی اپنی تنگ دستی و خستہ حالی کے مقابلہ میں ان حرام خوروں کے عیش و عشرت کو دیکھ کر
 دل شکستہ نہ ہوں۔ ان کو تلقین کرو کہ نماز پڑھیں۔ یہ چیز ان کے زاویہ نظر کو بدل دے گی۔ ان کے معیار فخر کو بدل دے گی۔ ان کی

أُولَٰئِكَ تَأْتِيهِمْ بَيِّنَةٌ مَّا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُمْ بَعْدَ آيٍ
 مِّنْ قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِنْ
 قَبْلِ أَنْ نُنزِلَ وَنَخْزِي ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلُّ مُتَرَبِّصٍ فَتَرَبَّصُوا فَسَتَعْلَمُونَ
 مَنِ أَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدَىٰ ﴿١٣٥﴾

اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا؟ اگر ہم اُس کے آنے سے
 پہلے ان کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمارے
 پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے
 اے محمد! ان سے کہو ہر ایک انجام کار کے انتظار میں ہے پس اب منتظر رہو، عنقریب تمہیں معلوم
 ہو جائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والے ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہیں۔

توجہات کا مرکز بدل دے گی۔ وہ پاک رزق پر صابر و قانع ہو جائیں گے اور اُس بھلائی کو جو ایمان و تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اُس
 عیش پر ترجیح دینے لگیں گے جو فسق و فجور اور دنیا پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔

۱۳۵ یعنی ہم نماز پڑھنے کے لیے تم سے اس لیے نہیں کہتے ہیں کہ اس سے ہمارا کوئی فائدہ ہے۔ فائدہ تمہارا اپنا ہی
 ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہوگا جو دنیا اور آخرت دونوں ہی میں آخری اور مستقل کامیابی کا وسیلہ ہے۔

۱۳۶ یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انہی میں سے ایک اُمی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک
 کی تمام کتب آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا سطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اُن کتابوں میں جو
 کچھ تھا، وہ سب نہ صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا، بلکہ اس کو ایسا کھول کر واضح بھی کر دیا گیا کہ صحرا نشین بد مذہب اس کو سمجھ کر
 فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۱۳۷ یعنی جب سے یہ دعوت تمہارے شہر میں اُٹھی ہے، نہ صرف اس شہر کا بلکہ گرد و پیش کے علاقے کا بھی شخص
 انتظار کر رہا ہے کہ اس کا انجام آخر کار کیا ہوتا ہے۔